حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور انکے رفقا کی نظر میں

تحریکِ پاکستان کے دینی اسباب و محرکات

مؤلف:
مولانا محمد زاہد صاحب
استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ امدادیہ

ناشر: مکتبۃ العارفی
جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

☆تحریکِ پاکستان کے دینی اسباب ومحرکات
حکیم الأمت حضرت تھانویؒ اور اُنکے رُفقا کی نظر میں☆

مئولف : مفتی محمد زاهد صاحب ، استادِ حدیث

جامعه اسلامیه امدادیه فیصل آباد

برفرمائشِ خاص : محمود غزنوی

معاونِ خصوصی : مفتی محمد امجد

حسین صاحب

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

نام کتاب: حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور ان کے رفقاء کی نظر میں

تحریک پاکستان کے دینی اسباب و محرکات

مؤلف: مولانا محمد زاہد

طبع اول: اگست 1999ء

تعداد طباعت: گیارہ سو (1100)

کمپوزنگ: خطاط کمپوزنگ سنٹر مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد

ناشر: مکتبۃ العارفی فیصل آباد

قیمت: -------------

پرنٹر: شنگریلا پرنٹرز فیصل آباد فون: 610226

ملنے کے پتے:

کشمیر بک ڈپو ---------- فیصل آباد

ادارہ اسلامیات ---------- لاہور

کتب خانہ مجیدیہ ---------- ملتان

ادارہ تالیفات اشرفیہ ---------- ملتان

مکتبہ رشیدیہ ---------- کوئٹہ

کتب خانہ صدیقیہ ---------- اکوڑہ خٹک

مکتبہ عمر فاروق ---------- کراچی

فہرست مضامین

پیش لفظ

کافی عرصے سے ذہن میں اس ضرورت کا احساس تھا کہ حضرت مجددالف ثانی ؒ کے دور سے لے کر حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد سے ہوتے ہوئے انگریزوں کے آخری دور تک کی برصغیر کی سیاسی تاریخ کے دینی نظریاتی اور مسلم تشخص کی بقاء کے پہلو پر ایک مفصل کتاب ہونی چاہئے تاکہ وہ نظریہ پاکستان' تحریک پاکستان کی اہمیت و ضرورت اور ان کے دینی پس منظر کے سمجھنے میں معاون ہو اور جس سے تحریک و قیام پاکستان کے بارے میں "ایک ہی شب میں پیدا بھی ہوا -----" کے تاثر کی جائے یہ واضح ہو کہ یہ دینی' سیاسی فکر اور جدوجہد کے طویل سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اسی رخ پر ہمیں آگے بڑھنا ہے' لیکن راقم الحروف نے کبھی خود کو اس کام کا اہل نہیں پایا۔

۱۹۹۳ء میں ایک دینی ماہنامہ میں ایک ایسا مضمون چھپا جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ قیام پاکستان کے بعد کے واقعات نے اس کا غلط ہونا اور اس کے مخالفین کی رائے کا صواب ہونا ثابت کر دیا ہے' جس شخصیت کا یہ مضمون تھا راقم الحروف کو ان کے مقابلے میں طفل مکتب بھی کہہ دیا جائے تو اس کے لئے بہت بڑی ڈگری اور سند ہو گی' اس لئے ان کے مضمون پر کسی تبصرے کا تو راقم تصور بھی نہیں کر سکتا تھا' البتہ اس طرح کی باتیں پہلے بھی سننے اور پڑھنے میں آتی رہیں کہ تحریک پاکستان کی حمایت اور کانگریس کی مخالفت کرنے والے علماء کا نقطہ نظر مسلم لیگی قائدین کے بارے میں محض چند خوش فہمیوں پر مبنی تھا جو بعد میں سراب ثابت ہوئیں' اس لئے اس موقع پر اس موضوع پر کچھ لکھنے کی تحریک جو اس طرح کی باتیں سن اور پڑھ کر پیدا ہوتی رہتی تھیں' تازہ ہو گئی اور ماہنامہ "الصیانہ" کے ادارتی صفحات پر "قیام پاکستان' چند قابل

توجہ پہلو" کے عنوان سے قلم اٹھایا' خیال تھا بات ایک دو قسطوں میں پوری ہو جائے گی لیکن خلاف توقع یہ مضمون سات قسطوں میں مکمل ہوا' جس سے اس موضوع کے ایک حصے پر گفتگو ہو گئی جس پر کام کی ضرورت کا عرصے سے احساس تھا۔

الحمد للہ بیشتر دینی حلقوں میں اسے پسند کیا گیا' بلکہ بعض ایسے بزرگوں نے بھی راقم کے سامنے اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا جن کے بارے میں اس کا اندازہ تھا کہ شاید یہ انہیں ناگوار ہو' بہت سے احباب اور بزرگوں نے ان مضامین کو الگ کتابی شکل میں شائع کرنے پر زور دیا' راقم الحروف سے متعلقہ رسالے لے کر یہ مضامین فوٹو کرانے کا سلسلہ بھی جاری رہا' راقم کا خیال تھا کہ ان مضامین پر بالتفصیل نظر ثانی کر کے ہی اسے کتابی شکل دی جائے لیکن فرصت کے انتظار میں یہ کام ملتوی ہوتا رہا' اب خیال ہوا کہ معمولی ترمیم و اضافات اور کہیں کہیں حاشیہ لکھ کر اسے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

"الصیانہ" میں چھپنے والی یہ قسطیں وقفے وقفے سے لکھی گئی ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ کہیں بے ربطی کسی ذوق لطیف پر گراں گزرے لیکن انشاء اللہ مجموعی طور پر اصل مدعا سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔

اس مضمون کا اصل مقصد حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور ان کے رفقاء و ہم خیال علماء کے موقف کی وضاحت کرنا ہے جو اصل میں تو شرعی دلائل پر مبنی تھا لیکن حضرتؒ نے متعدد مواقع پر اس وقت کے حالات پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے انہیں بھی اپنے موقف کی تائید میں پیش کیا ہے' خصوصاً ہندو قوم کے مزاج' گاندھی وغیرہ کی بدنیتی اور اس کی قیادت کا مسلمانوں کے لئے دینی و دنیوی لحاظ سے سخت نقصان دہ ہونا بیان کرتے ہوئے تو حضرتؒ کے لہجہ میں خاص قسم کی تیزی آجاتی ہے اور گاندھی کے متعلق "مکار" وغیرہ ایسے الفاظ بھی حضرت استعمال فرما جاتے ہیں جو آپ عموماً کسی مخالف کے بارے میں استعمال نہیں کیا کرتے تھے'

حضرت کی ایسی باتوں کی وضاحت کے لئے اس دور کے حالات پر بھی اس مضمون
میں کسی قدر روشنی ڈالی گئی ہے‘ یہ حالات مستند حوالوں کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں‘
تاہم راقم الحروف چونکہ کوئی تاریخ دان نہیں ہے اس لئے ایسے واقعات کے بیان
میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے‘ لیکن اس سے اصل مقصد پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔
حضرتؒ کے اس طرح کے ارشادات اس دور کے مشاہدات و تجربات پر مبنی ہیں‘ ان
تاریخی حوالوں پر نہیں۔

آخر میں ضمیمہ کے اندر کچھ اور مضامین بھی شامل اشاعت کر دیئے گئے ہیں
جو دوسرے موقعوں پر لکھے گئے تھے لیکن موضوع کے ساتھ مناسبت رکھتے تھے۔

دینی سیاست سے تعلق اور اس طرح کے موضوعات سے دلچسپی رکھنے
والے اہل علم اور دیگر حضرات سے یہ گزارش بھی کروں گا کہ اس مضمون کے
مندرجات‘ دلائل اور ان سے حاصل کردہ نتائج سے اگر انہیں اختلاف بھی ہو تب
بھی ”اب کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے“ کے زیر عنوان جو گزارشات کی گئیں ہیں
ان پر ضرور غور فرمائیں۔

محمد زاہد

۸ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ

حرف آغاز

قیام پاکستان اس صدی کا ایک بڑا اہم اور اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ ہے‘ اس
واقعے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے رونما ہونے سے پہلے اکابر علماء اور
بزرگانِ دین کی وہ جماعت بھی دو حصوں میں مٹ گئی جس کے علم و فضل‘ دیانت و
تقویٰ‘ اخلاص و للّٰہیت اور مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی پر کسی قسم کے شک و شبہ
کی گنجائش نہیں‘ اس تاریخی واقعے کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس کے ظہور پذیر
ہوئے نصف صدی گزرنے کے باوجود بعض حلقوں کی طرف سے یہ بحث جاری ہے
کہ ایسا ہونا بھی چاہئے تھا یا نہیں؟

چونکہ تحریک پاکستان ایک تاریخی اور خود پاکستان ایک عملی حقیقت ہے
اس لئے نئی نسل کے ذہن میں اس کے متعلق ”کیوں“ کا سوال ایک فطری امر
ہے‘ اس سوال پر قیام پاکستان کے بعد عموماً جو کچھ لکھا گیا اسے دو حصوں میں تقسیم کیا
جا سکتا ہے: ایک تو ان حضرات کی تحریریں ہیں جنہوں نے کانگریس کی حمایت
کرنے والے بزرگوں کے دفاع میں ان خدشات و خطرات کو واضح کیا ہے جن کی بنیاد
پر ان حضرات نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی اور پاکستان کی نصف صدی پر محیط
تاریخ میں سیاستدانوں اور حکمرانوں کی طرف سے اس ملک کے ساتھ روا رکھے گئے
برے سلوک اور ان کی کہہ مکرنیوں‘ طوطا چشمیوں اور مفاد پرستیوں کو بطور حجت اور
دلیل بیان کیا گیا ہے‘ ظاہر ہے کہ یہ موضوع کا یک طرفہ تعارف ہے۔

دوسری طرف قیام پاکستان کی ضرورت بیان کرنے والوں اور اس کی
حمایت میں لکھنے والوں میں واضح اکثریت ایسے حضرات کی ہے جو تحریک پاکستان کے
دینی محرکات بالخصوص پاکستان کی حمایت کرنے والے ہمارے بزرگوں کے نقطۂ نظر

سے ناواقف اور دوسری طرف کے بزرگوں کے ادب نا آشنا ہیں۔ ان حالات میں اکابر علماء دیوبند رحمۃ اللہ علیہم سے وابستہ حضرات جو اس ملک کی بقاء و تحفظ اور اس کی ترقی کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لئے تیار ہیں' ان کی ضرورت ہے کہ انہیں بتلایا جائے کہ ہمارے بزرگوں کی نظر میں قیام پاکستان کے دینی محرکات کیا تھے اور کس بنیاد پر ان حضرات نے تحریک پاکستان میں بھرپور کردار ادا کیا؟ ہم تحریک پاکستان میں ان بزرگوں کے عملی کردار پر تو کبھی کبھار گفتگو کر ہی لیتے ہیں لیکن اس کردار کی فکری اور نظریاتی بنیادوں سے قطع نظر کر کے ایک بہت بڑے دین دار حلقے میں فکری خلا کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ برصغیر کی سیاسی تاریخ' جدوجہد آزادی اور قیام پاکستان وغیرہ موضوعات پر ہمیں کون سا ایسا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے جس سے ہم کسی تاریخی غلط بیانی کے بھی مرتکب نہ ہوں اور وہ طرز عمل ملک کی دینی و ملی ضرورتوں سے ہم آہنگ بھی ہو۔ یہ چند احساسات و جذبات تھے جو اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے انگیخت پیدا کر رہے تھے۔ اگر معاملہ بزرگوں کی دو جماعتوں یا ان کی دو آراء میں تخطیہ و تصویب کا ہوتا یا یہ بحث ہوتی کہ کس شخصیت کی فراست و بصیرت اور سیاسی سوجھ بوجھ بڑھی ہوئی تھی تو یہ ناچیز اس موضوع کے قریب پھٹکنے کا بھی نہ سوچتا۔

مذکورہ بالا ارادے کو مزید تقویت اس بات سے ملی کہ ایک موقر دینی ماہنامے کے ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ کے شمارے میں ملک کی ایک عظیم دینی شخصیت کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں قیام پاکستان کی مخالفت کرنے والے بزرگوں کا نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش کی گئی' اس سے یہ عزم ابھرا کہ جب موضوع کے ایک پہلو پر گفتگو ہو گئی ہے تو دوسرے پہلو پر بھی قلم اٹھا کر موضوع کی تکمیل کر دینا مناسب ہے۔

موضوع کا اجمالی تعارف اور فریقین کا نقطۂ نظر

قیام پاکستان سے قبل ہندوستان میں بڑے سیاسی گروہ دو تھے ایک کانگریس جو سیکولرازم اور وطنی متحدہ قومیت کی بنیاد پر بلا لحاظ دین و مذہب تمام ہندوستانیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے حصول آزادی کی دعویدار تھی' دوسری طرف مسلم لیگ جو صرف مسلمانوں کی تنظیم تھی اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کی مستقل حکومت کا مطالبہ کر رہی تھی۔ ان دو جماعتوں کی حمایت یا مخالفت میں اکابر علماء دیوبند کی دو آراء ہو گئی تھیں: ایک طرف جمعیۃ علماء ہند کے اکابر تھے جو مسلم لیگ کے مخالف اور کانگریس کے حامی بلکہ بعض اکابر باقاعدہ اس کے ممبر تھے' دوسری طرف حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ' شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق رکھنے والے علماء تھے (جو بعد میں جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم پر حضرت علامہ عثمانی رحمہ اللہ کی زیر قیادت جمع ہو گئے تھے)۔ ان حضرات نے کانگریس اور اس کے نظریہ متحدہ قومیت کی مخالفت اور تحریک پاکستان کی حمایت کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل تقابل کانگریس و مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء ہند و جمعیۃ علماء اسلام کا تھا۔ تقابل کے وقت مسلم لیگ کو کانگریس کے بالمقابل اور جناح وغیرہ کو گاندھی وغیرہ کے بالمقابل رکھنا چاہئے' مسلم لیگ کا تقابل اکابر جمعیۃ علماء ہند سے کرنا ان حضرات کے علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کے مناسب نہیں۔

اس حقیقت کا تو شاید ہی کوئی باشعور انکار کر سکے کہ طرفین میں سے کوئی بھی کانگریس یا مسلم لیگ کو خیر محض نہیں سمجھتے تھے بلکہ دونوں کو دونوں کے بہت

سے مقاصد کا اندازہ بلکہ اعتراف تھا۔ چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ کے مکتوبات میں متعدد جگہ پر کانگریس میں شرکت کو اختیار اہون البلیتین قرار دیا گیا ہے۔
اسی طرح کانگریس کے دور اقتدار میں بہت سی مسلم دشمن سرگرمیوں پر جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے بھی صدائے احتجاج بلند کی گئی، مثلاً کانگریس کی واردھا سکیم کے خلاف جمعیۃ علماء ہند کی ایک قرارداد میں اس اسکیم کے کے ایک حصہ کی تشریح کانگریس کی واردھا کمیٹی کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کے حوالے سے یوں نقل کی گئی ہے:

"اس اسکیم کا آخری مقصد تعلیم یافتہ لوگوں کی
ایک جماعت پیدا کرنا ہے جس کا کلچر، عقیدہ اور جس کے
اعمال ایک ہی طرح کے ہوں، جو تمام مذاہب کے متعلق یہ
عقیدہ رکھے کہ وہ سب سچے ہیں اور ان کے درمیان کوئی
فرق نہیں، نیز اہمسا (گاندھی کا نظریہ عدم تشدد) پر ایمان ہو
اور اس پر عمل بھی ہو۔"

پھر اس کی تردید کرتے ہوئے چند سطروں کے بعد کہا گیا ہے:

"مگر اس طرز عمل کے برعکس ایک بنا دینے
والے کسی ایسے نیشنل ازم کا سبق پڑھایا جانے لگا جو اسلامی
تہذیب کی خصوصیات کو برباد کر دینے والا ہے تو یہ پالیسی نہ
صرف سطحی بلکہ آئندہ کی تباہی کا باعث ہوگی۔"

(جواہر الفقہ ج ۲/ص ۲۲۹)

اسی طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ پاکستان کی حمایت کرنے والے اکابر مسلم لیگ کے بارے میں زیادہ خوش فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ ان حضرات کو مسلم لیگ کی خامیوں اور ان خدشات کا پورا احساس تھا جن کا اظہار دوسری طرف سے اکابر رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا تھا۔ چنانچہ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب قدس

سرہٗ (جو اس وقت دارالعلوم دیوبند میں افتاء کے عظیم منصب پر فائز تھے) سے کانگریس اور مسلم لیگ کے بارے میں جو استفتاء کیا گیا تھا اس میں بھی یہ کہا گیا تھا:

"لیکن اس جماعت کے بڑے ذمہ دار لوگوں کے
متعلق بھی دین دار مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ یہ حضرات
شریعت کے پابند نہیں، ان سے بھی یہ خطرہ ہے کہ حکومت و
اختیارات مل جانے کے بعد خلافِ شرع قوانین نافذ کریں
اور دینیات سے بے پروائی اور تغافل ان کے اثر سے اور زیادہ
ہو جائے۔" (حوالہ سابقہ ج ۲/ص ۱۹۹)

اسی طرح حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے مضامین اور ملفوظات وغیرہ میں بھی مسلم لیگ کی کوتاہیوں (اس کے اہون البلیتین ہونے کے باوجود) کا تذکرہ بکثرت ملتا ہے، مثلاً امداد الفتاویٰ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق استفتاء کے جواب میں (جسے حضرت نے تنظیم المسلمین کے نام سے موسوم کر دیا تھا) مسلمانوں کی تنظیم کی ضرورت بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"مگر اس کے ساتھ ہی ہر مسلمان پر یہ بھی
واجب التسلیم والعمل ہے کہ وہ تنظیم حسب قدرت بالکل
احکام شرعیہ کے موافق ہو (جو آیت پیشانی میں اعتصام حبل
اللہ کی ولا تفرقوا پر تقدیم سے بھی ظاہر ہے) سو اگر اس وقت
ملک میں اس صفت کی کوئی منظم جماعت موجود ہوتی یا اس کا
ہونا متوقع قریب ہوتا تو جواب واضح تھا، لیکن موجودہ حالت
میں افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ ایسی جماعت کا نہ تحقق
ہے نہ قریب توقع۔ اس لئے بجز اس کے چارہ کار نہیں کہ
موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور

اس میں قواعد شرعیہ کی رو سے جو نقص ہو اس کی اصلاح کریں، اگر ان میں سے ایک کی اصلاح آسان اور دوسری کی دشوار ہو تو بقاعدہ عقلیہ ونقلیہ من ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما اس میں داخل ہو جائیں جس کی اصلاح آسان ہو۔" (امداد الفتاویٰ ص ۶۲۹ / ج ۴)

ایک موقع پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ سے فرمایا کہ

"مسلم لیگ بڑے لوگوں اور زمینداروں کی جماعت ہے، مجھے معلوم نہیں کہ اگر یہ جماعت آ، گئی تو یہ اسلامی نظام رائج کریں گے یا نہیں۔" (مولانا اشرف علی تھانویؒ اور تحریک آزادی مؤلفہ پروفیسر احمد سعید صاحب ص ۱۲۷)

اسی طرح ایک موقع پر آپؒ نے فرمایا:

"میں نے جو اعلان کیا ہے اس میں مسلم لیگ کی حمایت کی ہے مگر صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں قابل اصلاح (بلکہ واجب الاصلاح) ہیں، ہاں مسلم لیگ نسبتاً کانگریس سے اچھی اور بہت اچھی ہے، لہٰذا اس میں اصلاح اور درستی کی نیت سے شامل ہونا چاہئے۔ میں کانگریس کو اندھے کے مشابہ سمجھتا ہوں اور مسلم لیگ کو کانے کے مشابہ، ظاہر ہے کہ اندھے پر کانے کو ترجیح ہوگی۔" (حوالہ سابقہ)

حاصل یہ کہ دونوں طرف کے اکابر نے کانگریس اور لیگ میں سے جس کی

حمایت کی ہے وہ اسے خیر محض سمجھ کر نہیں بلکہ اھون البلیتین سمجھ کر کی ہے، جسے دیانتداری سے جس پہلو میں بہتری اور مسلمانوں کا مفاد نظر آیا اس نے اسے اختیار کیا اور اسی کی دعوت دی۔ ان میں سے کسی کی رائے سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے اخلاص، للّٰہیت، مسلمانوں کی ہمدردی اور دیانت داری میں شک و شبہ کرنا یا ان میں سے کسی کی عظمت و احترام کے منافی انداز اختیار کرنا خسران عظیم کا باعث ہے، ان قدسی نفوس کی عقیدت و محبت اور ان سے وابستگی ہمارے لئے ایک عظیم سرمایہ ہے۔ ان سطور کی تحریر کے وقت بھی احقر کا دل اس دعاء سے لبریز ہے کہ یااللہ اس عقیدت و محبت میں اضافہ فرمائیے، اسے نجات کا ذریعہ بنائیے اور زبان و قلم کی ہر ایسی لغزش سے تادمِ آخر محفوظ رکھیئے جس میں اس محبت کی منافات کا ادنیٰ سا شائبہ بھی ہو، آمین۔

ایک تیسرا راستہ بھی موجود تھا

آگے چلنے سے قبل احقر ایک اور سوال پر غور کی دعوت دینا چاہتا ہے، وہ یہ کہ کیا کوئی تیسرا راستہ ایسا موجود نہیں تھا جسے اختیار کر کے لیگ اور کانگریس دونوں کے مفاسد سے بچا جا سکتا تھا؟ احقر کے خیال میں اس کا جواب اثبات میں ہے یعنی ہندوستان کی اس سیاسی تاریخ میں ایسا وقت بھی آیا جس میں اختیار اھون البلیتین کی مجبوری کی بجائے "اندھی" اور "کانی" دونوں بلیتین سے بچا جا سکتا تھا لیکن اس وقت اس تیسرے راستے کو اختیار نہیں کیا گیا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ علامہ اقبال کے علیحدہ اسلامی ریاست کا تصور پیش کرنے اور مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان سے قبل حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ کے سامنے اسلامی مملکت کے

قیام کی تجویز رکھ دی تھی' چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں :

"حضرت تھانویؒ کو بعض معاصر علماء کی طرح
"جنگ آزادی" "جنگ حقوق" "آزادیٔ وطن وغیرہ سے کوئی
خاص دلچسپی نہ تھی۔ ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں تمام تر
دینی تھا' وہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء
میں جب پہلی بار حاضری ہوئی تو حضرت نے دارالاسلام کی
اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی' پاکستان کا تخیل'
خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی
ہیں' پہلے پہل اس قسم کی آوازیں ہمیں کان میں پڑیں'
حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔" (تعمیر پاکستان
اور علماء ربانی از منشی عبدالرحمن خان مرحوم ص ۲۶۶)

دارالاسلام کی اس اسکیم کی ساری تفصیلات جو حضرت نے دوران گفتگو بیان فرمائی ہوں گی معلوم نہیں کی جاسکتیں' البتہ اس کا کچھ حصہ مولانا دریابادی نے یوں نقل کیا ہے :

"دل یوں چاہتا ہے کہ :

(۱)۔۔۔۔ ایک خطہ پر اسلامی حکومت قائم ہو۔
(۲)۔۔۔۔ سارے قوانین وغیرہ کا اجراء احکام شریعت کے مطابق ہو۔
(۳)۔۔۔۔ بیت المال ہو۔
(۴)۔۔۔۔ نظام زکوٰۃ رائج ہو۔
(۵)۔۔۔۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں وقس علی ہذا۔

دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں' اس مقصد کے لئے صرف مسلمانوں کی جماعت ہونی چاہئے اور اسی کو یہ

کوشش کرنی چاہئے۔" (حوالہ سابقہ ص ۳۵)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نے الگ اسلامی ریاست کا نظریہ مسلم لیگ سے پہلے قائم فرمالیا تھا اور آپ کو یہ بھی احساس تھا کہ یہ کام کانگریس سے مل کر نہیں ہو سکتا' اس کے لئے مسلمانوں کی الگ تنظیم کی ضرورت ہے اور اس وقت مسلم لیگ موجود تھی اور وہ اپنے تئیں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار بھی تھی لیکن حضرت نے اپنا یہ نظریہ ابتداءً مسلم لیگ کے سامنے پیش نہیں کیا بلکہ مختلف سیاسی نظریہ رکھنے والے ایک عالم ربانی کے سامنے پیش فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت کے نزدیک اس کے اصل اہل یہی علماء ربانی تھے۔ الگ اسلامی ملک تو قائم ہونا ہی تھا' حضرت کی یہ خواہش تھی کہ یہ کام مسلم لیگ کے وڈیروں' نوابوں یا "کھوٹے سکوں" کی بجائے علماء ربانی کے ہاتھوں انجام پائے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ :

"عوام کے حالات سے جتنی واقفیت ان کو ہے
کسی اور کو نہیں۔"

حضرت شیخ الہند (بلکہ شیخ العالم) قدس سرہٗ نے گو یہ بات ایک غیر سیاسی سیاق میں فرمائی تھی لیکن سیاسی میدان میں بھی آپ کی یہ بات سچی ثابت ہوئی اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بعض اوقات عامۃ المسلمین کے سیاسی طرز عمل کے بارے میں قبل از وقت ایسے درست اندازے لگائے کہ شاید رائے عامہ ناپنے کے ماہرین بھی اپنے جدید طریقوں کو اختیار کر کے اس سے بہتر نہ لگا سکتے۔ چنانچہ آپ نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ عام مسلمان اب کانگریسی سیاست سے بیزار ہو رہے ہیں' ایک مرتبہ آپ نے گاندھی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا :

"اس زمانے میں ایک طاغوت ہے' عقل تو اس

کو چھو کر بھی نہیں گئی' سارے ملک میں فتنہ و فساد کا تخم بو دیا
ہے اور مسلمانوں کی بھولی قوم اس کے مکر و فریب میں آ گئی
اور اس کو اسلام اور مسلمانوں کا خیر خواہ سمجھ بیٹھی حالانکہ وہ
اسلام اور مسلمانوں کا سخت دشمن ہے۔ متواتر واقعات سے
اللہ تعالیٰ نے اس کی دشمنی کو طشت از بام کر دیا ہے اور لوگوں
کو واقعی یقین آ گیا ہے کہ واقعی نہایت مکار اور چالاک شخص
ہے۔ غنیمت ہے کہ اب بھی جلدی صبح ہو گئی ہے کہ لوگ
اس کے مکر و فریب سے آگاہ ہوئے۔" (مولانا اشرف علی
تھانویؒ اور تحریک آزادی ص ۳۸)

اس طرح قیام پاکستان سے کئی سال پہلے فرمایا تھا کہ ہوا کا رخ بتا رہا ہے کہ
لیگ والے اپنے مقصد (حصول پاکستان) میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بعد میں
حضرت کے خیال کی تصدیق اس بات سے ہو گئی کہ مسلم لیگ کبھی بھی کوئی عوامی
جماعت نہیں رہی تھی' اس کے اکثر رہنما ایسے تھے جنہیں مسلم عوام سیاسی امور میں
کوئی زیادہ وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ خلوص' محنت' عظمت کردار اور جرأت
مندانہ کوششوں (جس میں رؤسا مسلم لیگ کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا) کی وجہ سے
اکابر جمعیۃ علماء ہند کا عوام پر اثر و رسوخ کئی گنا زیادہ تھا' اس کے باوجود جب مسلم لیگ
موقع کو سمجھتے ہوئے کانگریس کی مخالفت' مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم اور قیام پاکستان کا
نعرہ لے کر میدان میں آئی تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرد مسلم عوام اچھی خاصی
تعداد میں جمع ہو گئے اور یہ جماعت ایک تحریک کی حیثیت اختیار کر گئی۔

حاصل یہ ہے حضرت کو یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ مسلم عوام کانگریس کا
زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دے سکیں گے۔ حضرت کی خواہش کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ
اگر لوگ کانگریس کے شر سے رجوع کر رہے ہیں تو وہ کہیں اس سے نکل کر دوسرے

شر میں نہ پھنس جائیں (گو وہ پہلے شر سے اہون ہو) بلکہ ان کو خیر محض کا راستہ
مہیا کیا جائے' وہ راستہ یہی تھا کہ علماء حق کانگریس اور ہندوؤں سے الگ ہو کر
مسلمانوں کی مؤثر تنظیم قائم کریں (گو یہ تنظیم حدود شریعت میں رہتے ہوئے
ہندوؤں سے مصالحت و موادعت کا معاملہ رکھنے کی کوشش کرے اس لئے کہ
حضرت حکیم الامتؒ بھی ہندوؤں سے از خود مقابلہ چھیڑنے کے قائل نہ تھے) اور
مسلمانوں کی یہ تنظیم علماءِ حق کی زیر قیادت الگ اسلامی ریاست کی کوشش کرے۔

اگر اس وقت حضرت کا یہ مشورہ (اس کی مزید تطویر و تہذیب کے بعد) مان
لیا جاتا اور تحریک پاکستان کی قیادت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ
اللہ' حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رحمہ اللہ جیسے اکابر کر رہے ہوتے تو آج نقشہ ہی
مختلف ہوتا' مسلم لیگ تاریخ کا ایک قصہ پارینہ بن چکی ہوتی اور دوسری چھوٹی چھوٹی
جماعتوں کی طرح عام لوگ اس کے نام سے بھی واقف نہ ہوتے۔ جس اسلامی ملک
کے معمار ایسے نفوس قدسیہ ہوتے اس کی حالت ہی کچھ اور ہوتی' نہ صرف ملک کے
اندر مکمل اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرہ قائم ہو چکا ہوتا بلکہ یہ ملک بین الاقوامی
سطح پر مسلمانوں کے مسائل کے حل کے سلسلہ میں موجودہ حالت سے کہیں بہتر
پوزیشن میں ہوتا اور وہ سب کچھ نہ ہوتا جو اس ملک کی بناء و تعمیر میں بعض غلط ہاتھوں
کی شمولیت کی وجہ سے ہوا اور جس کے تصور سے دل زخمی اور تذکرے سے زبان
کڑوی ہو جاتی ہے لیکن کاش کہ ایسا نہ ہو سکا' شاید اللہ تعالیٰ کو ابھی اسلام اور مسلمانوں
کی قوت کے ساتھ نشاۃ ثانیہ منظور نہ تھی' اس کی تاخیر ہی میں ان کی حکمتیں مضمر
تھیں' اس سلسلے میں کسی کو ملامت نہیں کی جا سکتی (اس لئے کہ ان حضرات میں
سے جس نے جو رائے بھی قائم کی' دیانتدارانہ طریقے سے صحیح اور مفید سمجھ کر قائم کی
اور نہ ہی کسی موقع پر ان کی رائے کو اجتہادی خطاء قرار دینے کی وجہ سے ان کے علمی'
عملی کمالات' امت مسلمہ پر ان کے احسانات بالخصوص ان کے مجاہدانہ کارناموں کو

نظر انداز کیا جا سکتا ہے اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ اپنا ہی نقصان کر رہا ہے)۔

شاید ان حضرات کا خیال ہو کہ ان حالات میں اسلامی ریاست کے حصول میں کامیابی کے امکانات نہیں یا یہ کہ ان حالات میں کانگریس سے علیحدگی اور الگ اسلامی ریاست کے مطالبہ سے انگریزوں کے اخراج کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ جائے گا (اور ہندوستان سے انگریز کا اخراج حضرت مدنی رحمہ اللہ کا صرف نظریہ نہیں تھا بلکہ آپ کا یہ حال بن چکا تھا اور کوئی ایسی تجویز آپ کی توجہ کی مستحق نہیں بن سکتی تھی جس سے اس مقصد میں تعویق کی بُو بھی آتی ہو) لیکن بعد کے حالات نے ان دونوں خدشوں کی تصدیق نہیں کی۔ مسلم لیگ کی مطالبہ پاکستان میں کامیابی نے یہ ثابت کر دیا کہ اس وقت اس قسم کی کوشش کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی البتہ دوسرا خدشہ اس وقت بظاہر زیادہ اہم معلوم ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے مسلم لیگ کی حمایت سے قبل زعماء لیگ سے جو سوالات کئے تھے ان میں سے تیسرا سوال یہ تھا کہ کانگریس سے مسلمانوں کی علیحدگی آزادیٔ ہندوستان کے مسئلہ میں باعث تعویق و تاخیر نہ ہوگی۔ (مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی ص ۱۰۷) لیکن بعد میں مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ کر کے حصول پاکستان کے لئے اس جماعت نے تحریک چلائی جسے انگریزوں کا حمایتی بلکہ "انگریزی زہر" کہا جاتا تھا، اس کے باوجود سب نے دیکھا کہ انگریزی اقتدار کا خاتمہ پھر بھی ہو گیا، ظاہر ہے کہ اگر وہ اکابر جن کی انگریز دشمنی میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا یہ نعرہ لے کر میدان میں آتے تو اس آزادیٔ ہند کا مقصد کیسے متاثر ہو سکتا تھا۔

ان گزارشات کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ جن مقاصد کے لئے حضرت نے مسلم لیگ کی حمایت کی تھی، حضرت اصل میں ان کا حصول ان علماء ربانی کے ہاتھوں چاہتے تھے، جب ادھر سے مایوسی ہوئی تو آپ نے مسلم لیگ کو اہون البلیتین سمجھ کر اس کی حمایت اور اصلاح کا اعلان فرمایا۔

حضرت تھانویؒ نے مسلم لیگ کی رائے اختیار نہیں کی بلکہ معاملہ برعکس ہوا

ان تفصیلات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم اور تحریک پاکستان وغیرہ معاملات پر مسلم لیگ کی حمایت سادہ لوحی اور سیاسی بھولا پن کی وجہ سے مسلم لیگیوں کے دلفریب وعدوں اور ان کی طرف سے دکھائے گئے مسحور کن خوابوں اور سبز باغوں سے متاثر ہو کر اس وقت کے سیاسی حالات کا جائزہ لئے بغیر ہی نہیں کر دی تھی بلکہ آپ کی شرعی بنیادوں پر پہلے سے ایک طے شدہ رائے تھی۔ مسلم لیگ کی گزشتہ تاریخ جیسی بھی تھی، اس وقت حضرت کے طے شدہ نظریہ کے قریب تر آ گئی تھی اس لئے آپ نے اس کی مشروط حمایت فرما دی۔ گویا اصل صورت حال یہ ہے کہ آپ نے مسلم لیگ کے کسی نظریہ کو اختیار نہیں فرمایا بلکہ مسلم لیگ حالات و تجربات کی وجہ سے اس "ملا" کی رائے کی طرف آنے پر مجبور ہو گئی تھی [۱] ورنہ ایک عرصے تک مسلم لیگ بھی کانگریس کے ساتھ شریک اور بے قید ہندو مسلم اتحاد کی زبردست حامی رہی تھی، خود قائداعظم ایک عرصے تک ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلاتے رہے۔

---

[۱] بات یہ نہیں تھی کہ حضرتؒ اس وقت کے سیاسی حالات سے سب سے زیادہ آگاہ تھے بلکہ اصل بات یہ تھی کہ آپ اپنی سیاسی سوچ کو بھی شرعی بنیادوں پر استوار کرنے کے طرز عمل پر مضبوطی سے کاربند تھے۔ یہ ان شرعی اصولوں کا اعجاز تھا کہ حالات زمانہ سے واقفیت کا دعویٰ رکھنے والے جدید طبقے کو بھی آخرکار تجربات کی وجہ سے آپ کی رائے قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے تھانہ بھون میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"جب تک مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ تھی حضرت حکیم الامت اس سے علیحدہ رہے کیونکہ کانگریس پر آپ کو بھروسہ نہیں ہے' یہ قوم (ہندو) غدار ہے' پہلے بھی ۱۸۵۷ء میں دھوکہ دے چکی ہے اور حدیث میں ہے: مؤمن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔ مسلم لیگ تجربہ کے بعد کانگریس سے علیحدہ ہو گئی' اب ہم اس کے ساتھ ہیں مگر جب تک لیگ کے عہدہ داران دین و مذہب کے پابند نہ ہو جائیں گے اس وقت تک ان پر بھی پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ (تذکرۃ الظفر مؤلفہ حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی مدظلہ ص ۳۵۸)

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

"مسلم لیگ اگر حیثیت جماعت پیچھے بھی رہ جائے تو اب ہندوستان کے ہزاروں علماء جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم پر جمع ہو چکے ہیں' پاکستان کے حصول میں اگر ہماری جانیں بھی کام آ جائیں تو ہم اس سے دریغ نہیں کریں گے۔

(حوالہ سابقہ ص ۳۸۲)

پھر حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے محض مسلم لیگ کی حمایت نہیں کی تھی بلکہ اس میں شامل ہو کر اس کی اصلاح کی طرف بھی بھرپور توجہ دلائی تھی اور یہ فیصلہ بھی آپ نے جمعیۃ العلماء ہند اور مسلم لیگ دونوں سے ضروری سوالات کرنے' مسلم لیگ کی طرف سے واضح جوابات آ جانے اور دوسری طرف بار بار کی یاددہانی کے بعد جوابات سے مایوس ہونے کے بعد ہی فرمایا تھا۔

مسلم لیگ و تحریک پاکستان کی حمایت اور کانگریس کی مخالفت کے اسباب و وجوہ

اس تحریر کا اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ آپ نے جو سیاسی رائے قائم فرمائی تھی اس کی شرعی اور واقعاتی بنیادیں کیا تھیں؟ یہی بات اگلے صفحات میں نمبروار واضح کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

(۱) اصل مسئلہ شرعی جواز و عدم جواز کا تھا

ویسے تو کسی بھی عالم ربانی کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سیاست کو دین سے الگ سمجھ کر اس میں شرعی مسائل کی رعایت کا قائل نہیں ہو گا' لیکن سیاسی امور میں بھی مسائل کی رعایت کا اہتمام اور اس کی تاکید جتنی حضرت کے ہاں نظر آتی ہے وہ اور کہیں نہیں' اس کا اندازہ حضرت کے مواعظ اور ملفوظات کا مطالعہ کرنے والے بآسانی لگا سکتے ہیں جن میں مسائل پر عمل ہی نہیں بلکہ اس کے لئے مصالح کو پیس دینے کی تاکید اور ان لوگوں کی تردید کی گئی ہے جو کہا کرتے تھے کہ اب کام کرنے کا وقت ہے مسائل کی رعایت کا وقت نہیں۔ حضرت کی اس نوع کی عبارات کو اکٹھا کیا جائے تو اچھا خاصہ دفتر تیار ہو سکتا ہے' مثلاً آپ نے فرمایا:

"حضرات! جنگ آئینی ہو یا غیر آئینی مسلمان کو بجز خدا کے کسی کی امداد کی ضرورت نہیں اور امداد الٰہی کی شرط احکام الٰہی کی پابندی ہے جس کا سینکڑوں برس تجربہ کیا جا چکا ہے۔ جب تک مسلمان سچ مچ مذہبی دیوانے بنے رہے

دنیا ان کے جوتوں سے لگی رہی اور جوں جوں اس میں کمی آتی
گئی مسلمان ترقی سے محروم ہوتے گئے۔"

(اصلاح المسلمین ص ۵۲۹)

پھر آپ اس میدان میں بھی بے لگام اجتہاد کا دروازہ چوپٹ کھولنے کے سخت مخالف اور اجتہاد و تقلید کی طے شدہ حدودِ اعتدال کی پوری پوری پابندی کے قائل تھے، چنانچہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا:

"مذہب اسلام میں جو ایک حصہ سیاسیات کا ہے وہ مدون ہے، اس تدوین کے موافق اس کو اختیار کرو، وہ بہت کافی ہے اور وہ خالص مذہبی سیاست ہے، اس میں گڑبڑ اور کتر بیونت کرنا جائز نہیں جیسا کہ آج کل طبائع میں یہ مرض عام ہو گیا ہے کہ ہر جگہ اپنی رائے کو دخل دینا چاہتے ہیں۔"

(حوالہ سابقہ ص ۵۳۳)

آپ دیگر مسائل کی طرح سیاسی مسائل پر بھی سب سے پہلے اس نقطۂ نظر سے غور فرماتے تھے، کانگریس میں شرکت کے سوال پر بھی آپ نے اس نقطۂ نظر سے غور فرمایا، ہندوؤں سے اشتراک عمل کے ابتدائی دور میں (حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی زندگی کے آخری دور میں) حضرتؒ کے نزدیک یہ اشتراک فقہی نقطۂ نظر سے فی نفسہٖ جائز تو تھا لیکن اس کے حدودِ جواز سے نکلنے کا خطرہ تھا، بعد کے دور میں یہ خطرہ حقیقت بن چکا تھا، بعد کے حالات میں بہت سے دلائل کی بنیاد پر حضرتؒ اور دوسرے بہت سے علماء کی رائے یہ ہو گئی تھی کہ جس طریقے سے مسلمان کانگریس میں شرکت کر رہے ہیں یا ان کو اس کی دعوت دی جا رہی ہے وہ شرعاً جائز ہے، ان حالات میں جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کے لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی

مستقل تنظیم قائم کریں، افراد کی کانگریس میں غیر مشروط شرکت کی بجائے مسلمانوں کی یہ تنظیم ہندوؤں کے ساتھ اتحاد وغیرہ کے معاملات حدود شریعت میں رہتے ہوئے طے کرے، کانگریس میں شرکت کے عدمِ جواز کے دلائل کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں، اس کے لئے جواہر الفقہ میں شامل مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے رسالے "ملکی سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی حدود شرعیہ" اور عربی دان حضرات کے لئے اعلاء السنن کی بارہویں جلد کی طرف رجوع کرنا مناسب ہے۔

البتہ اول الذکر رسالے کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی تعلق کی تین صورتیں بنتی ہیں: ایک یہ کہ کفار کے ساتھ محض مصالحت یا تجارتی معاملات وغیرہ کے متعلق معاملہ ہو اشتراکِ عمل اور استمداد و استعانت نہ ہو، یہ صورت جائز ہے بشرطیکہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت پیشِ نظر ہو اور شرائطِ صلح اسلام کے خلاف نہ ہوں۔ دوسری صورت یہ کہ کفار کے ساتھ باقاعدہ شرائط و معاہدہ کے تحت اشتراکِ عمل ہو اور کسی کافر قوم کے خلاف ان سے مدد اور تعاون حاصل کیا جائے، یہ صورت تب جائز ہے جب کہ فیصلوں اور پالیسیوں میں مسلمان غالب ہوں اور کفار مغلوب ورنہ ناجائز ہے۔ تیسری صورت یہ کہ مسلمان انفرادی طور پر بغیر کسی شرط اور معاہدے کے کفار کے ساتھ شامل ہو جائیں، یہ صورت بالاتفاق ممنوع ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے زمانے میں تحریکِ آزادی کا علم مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا، ہندو تابع محض بن کر شامل ہو رہے تھے اس لئے یہ اشتراک عمل جائز تھا لیکن بعد میں رفتہ رفتہ صورتِ حال بالکل مختلف ہو گئی، پہلے خلافت کمیٹی ایک

مستقل تنظیم تھی جس نے ہندوؤں سے باقاعدہ مصالحت کی ہوئی تھی جب کہ بعد کے دور میں مسلمانوں سے یہ کہا جارہا تھا کہ وہ کانگریس میں انفرادی حیثیت سے محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے شریک ہوں' اب کانگریس میں ہندوؤں کا پلڑا بھاری تھا جس کا اندازہ اگلے نمبروں میں مذکور کانگریس کے اسلام اور مسلمان دشمن متعدد فیصلوں سے ہوگا' دوسری طرف فکری اور نظریاتی طور پر گاندھی کو بے پناہ اہمیت حاصل ہوچکی تھی اور تمام پالیسیوں میں وہی اثر انداز ہوتا تھا جس کا اندازہ اس زمانے میں مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ سے کیے گئے استفتاء کے درج ذیل اقتباس سے بھی ہوتا ہے :

"ملاحظہ ہو مولانا ابوالکلام آزاد کا خطبہ صدارت اجلاس رام گڑھ کانگریس منعقدہ ۱۹۴۰ء' جس کے الفاظ یہ ہیں کہ مسٹر گاندھی کی لیڈر شپ قیادت وامامت پر ایمان کامل کامیابی کی تین شرطوں میں سے ایک شرط ہے۔

اچاریہ کرپلانی کہتے ہیں : یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ کانگریس کی ہر اسکیم گاندھی جی کے فلسفہ کے ماتحت چلائی جائے گی یہ ہرگز ممکن نہیں' آپ کسی اصلاحی سکیم کو کسی اور فلسفۂ زندگی کے اصول پر چلائیں' یہ گاندھوی فلسفۂ زندگی کسی اور فلسفۂ زندگی کا ماتحت نہیں بنایا جا سکتا ملاحظہ ہو۔ "مدینہ بجنور ۷ اگست ۱۹۳۹ء امرتا بازار پتریکا کلکتہ مؤرخہ ۸ اگست ۱۹۳۹ء" (جواہر الفقہ ج ۲/ص ۱۹۹)

کیا کانگریس میں شرکت
حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا اتباع تھی؟

جو حضرات ان نئے حالات میں بھی کانگریس میں شرکت کو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا اتباع سمجھتے تھے ان کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

مسئلہ چہارم :- "حامیان کانگریس میں سے بعض حضرات اس اشتراک کو اُستاذی حضرت مولانا دیوبندیؒ کا اتباع سمجھتے ہیں اور بعض اصحاب اس اختلاف کو مثل اختلاف حنفی شافعی کے خیال کرتے ہیں' سو میرے نزدیک یہ دونوں خیال محض غلط ہیں۔ حضرت مولانا کا اشتراک مصالحت تھا نہ کہ متابعت یعنی اس وقت تحریک خلافت نہایت قوت پر تھی جس سے مولانا کو قوی امید تھی کہ حکم اسلام کا غالب ہوگا اور ہم لوگوں کا خیال قرائن ووجدان سے اس کا عکس تھا۔ سو یہ اختلاف محض رائے کا اختلاف تھا اور مثل اختلاف شافعی حنفی کے اجتہادی تھا۔ اس اشتراک میں متابعت کے شائبہ کا وہم بھی نہ تھا یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی شعار اسلامی کے ضعف یا کسی شعار کفر کی قوت کا اشبہ بھی ہوتا تھا تو فوراً اس پر نکیر شدید فرماتے تھے' چنانچہ مشاہدہ متواترہ اس کا شاہد ہے خلاف اس وقت کی حالت کے کہ اب کانگریس کی قوت سے کفر و شرک کا حکم غالب ہے اس کی ہر تجویز سے

موافقت و مداہنت کی جاتی ہے' اس وقت کا اشتراک صورت
ادغام بالکل متابعت ہے جو کہ ناجائز ہے اس لئے مسلمانوں کو
اپنی تقویت و تنظیم مستقل لازم ہے تاکہ اس کے بعد جو
اشتراک ہو مصالحت ہو متابعت نہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ اشتراک
ایک لفظ مشترک ہے مگر اس کے دو فردوں کا یعنی مصالحت و
متابعت کا حکم جدا جدا ہے' پس حقیقی امتیاز کے بعد محض لفظی
اشتراک سے اشتباہ نہ ہونا چاہئے۔"

اس کے برعکس مسلم لیگ بنیادی طور پر مسلمانوں ہی کی تنظیم تھی اس کے بیشتر ارکان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا تھا وہ فاسق و فاجر ہیں ؎ اور ایسے امور میں کفار کے مقابلہ میں فساق کے ساتھ اشتراک میں شرعاً کوئی حرج نہیں' چنانچہ مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ائمہ' اسلام اس پر متفق ہیں کہ کفار کے مقابلہ
میں فساق و فجار اور نام کے مسلمانوں کی بھی حمایت و اعانت
میں کوئی مضائقہ نہیں اور جہاد وغیرہ امور دینیہ میں ان سے
استعانت اور ان کی اعانت بلا خلاف جائز ہے۔"

اس کے بعد حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے اپنے اس دعوے کو متعدد

؎ یہاں بعض سطحی ذہن کے حضرات قائداعظمؒ وغیرہ کے ایمان و کفر کی بحث شروع کردیتے ہیں' یہاں اس بحث میں پڑے بغیر صرف اتنا عرض کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا جنازہ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے پڑھایا تھا جو ہمارے بزرگوں میں قائداعظم رحمہ اللہ کو سب سے زیادہ قریب سے جاننے والے تھے۔ دوسری طرف شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ نے ان کی وفات کے بعد اپنے ایک مکتوب میں ان کے لئے دعائے مغفرت فرمائی ہے۔
(ملاحظہ ہو مکتوبات شیخ الاسلام)

حوالہ جات سے ثابت فرمایا ہے۔ حاصل یہ کہ حضرت تھانویؒ اور ان کے متبعین کے نزدیک ٹھوس دلائل شرعیہ کی بنیاد پر کانگریس میں شرکت ناجائز تھی اور مسلمانوں کی الگ تنظیم ضروری۔

(۲) کانگریس میں شرکت مسلمانوں کے لئے خطرناک تھی

پھر فقہی لحاظ سے اس وقت کانگریس میں شرکت فی نفسہٖ جائز بھی ہوتی تب بھی بہت سے مفاسد اور خطرات کی وجہ سے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ انگریز کے پاس قوت اور اقتدار سب کچھ موجود تھا' اس لئے اس کے مظالم اور مسلم دشمنی سب پر واضح تھی جب کہ ہندو مسلمانوں کی طرح اقتدار سے محروم اور انگریز کا محکوم تھا جس کی وجہ سے انگریز دشمنی کے جوش و جذبے نے ہندو ذہنیت پر پردہ ڈال رکھا تھا لیکن حقیقت میں ہندو اسلام دشمنی میں انگریز سے کچھ کم نہ تھا۔ انگریز دشمنی میں ہندوؤں کو مسلمانوں کا شریک سمجھا جاتا تھا' لیکن ہندوؤں کی انگریز سے نفرت کی وجہ اس کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے کہ وہ غیر ہندوستانی اور بدیسی حکمران ہے' باہر سے آنے والے کو ہندوستان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے' بہت سے مسلمان سلاطین بھی ہندی الاصل نہیں تھے وہ بھی بدیسی حکمران تھے' انہوں نے انگریز سے کئی گنا زیادہ عرصہ تک ہندو اکثریت پر حکومت کی تھی' پھر جو مذہب یا تہذیب بھی ہندوستان میں آئی ہے اسے ہندوستانی تہذیب اور رسم ورواج نے اپنے اندر جذب کر کے اپنے رنگ میں رنگ لیا' باہر سے آنے والی کوئی تہذیب بھی یہاں اپنا مستقل تشخص برقرار نہ رکھ سکی لیکن اسلام اور اسلامی تہذیب نے ہندی تہذیب سے بعد المشرقین پر ہونے کے باوجود اس کا بھرپور مقابلہ کر کے یہاں اپنا سکہ جمایا اور اپنا مستقل تشخص

برقرار رکھا۔ اگر کہیں ہندی تہذیب و تمدن نے مسلمانوں پر اپنا رنگ چڑھا کر اسلامی تشخص کو کمزور کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، سید احمد شہیدؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت تھانویؒ اور دیگر علماء حق رحمۃ اللہ علیہم کے ذریعے سے اس کا انسداد فرمایا، ان وجوہات کی بنا پر ہندو اگر انگریز سے دشمنی رکھتا تھا تو مسلمانوں کا خیر خواہ بھی نہیں ہو سکتا تھا، بعض لوگ ہندو کو ایک غیر مضرت رساں اور رحم دل قوم سمجھتے تھے جس کا بڑا مظہر ان کی گوشت خوری سے پرہیز سمجھا جاتا تھا لیکن ہندو جانوروں یا اور لوگوں کے ساتھ رحم دلی کرے تو کرے مسلمانوں کے بارے میں اس کی سوچ اور طرز عمل بالکل مختلف تھا، اس کا اندازہ ایک ہندو لیڈر مہاشہ پرتاب سنگھ کی اس بات سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے ۱۹۲۷ء میں سکھر میں تقریر کرتے ہوئے کہی تھی:

> "ہندو دھرم میں جانوروں کا گوشت کھانا منع ہے
> لیکن مسلمانوں کا خون پینا جائز ہے، کسی ہندو کو اس کے پینے
> میں پس و پیش نہیں کرنا چاہئے۔ (تعمیر پاکستان اور علمائے
> ربانی از منشی عبدالرحمان خان مرحوم ص ۲۸)

حقیقت یہ ہے کہ ہندو سیاست کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ پرتاب سنگھ نے خون مسلم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ ہندو قائدین کی سوچ اور ان کے اندرونی خیالات اور چھپے ہوئے بغض و عناد کی صحیح ترجمانی ہے۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُوْرُهُمْ اَكْبَر ہندو لیڈروں کی اسلام اور مسلم دشمنی محض ایک پروپیگنڈہ اور انگریز کی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کا ایک حصہ ہی نہیں بلکہ ایک مستقل حقیقت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندو اپنے عمل سے اس کی تردید کر کے انگریزی عزائم کو ناکام بنا سکتا تھا لیکن ہندو مسلم اتحاد کی داعی کانگریس بھی ایسا نہ کر سکی۔ ہندو کی اسلام دشمنی کی تفصیل کا تو موقع نہیں البتہ بطور

نمونہ چند امور پیش خدمت ہیں:

ہندو کی طرف سے شدھی تحریک (مسلمانوں کو ہندو بنانے کی تحریک) چلائی گئی جس کے انسداد کے لئے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے مختلف علاقوں میں تبلیغ کے لئے علماء کے وفود بھیجے جن میں سرفہرست حضرت مولانا عبدالکریم گمتھلوی اور حضرت مولانا عبدالمجید صاحب بچھرانویؒ تھے، انہی دنوں رئیس التبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی اسی مہم پر نکلے ہوئے تھے، خود حضرت تھانویؒ نے بہت جگہوں پر اس سلسلے میں وعظ کہے۔ (ملاحظہ ہو اشرف السوانح ج ۳ / ص ۲۳۸)

ارتداد کی اس تحریک میں کانگریسی اور غیر کانگریسی ہندو قائدین کا پورا پورا ہاتھ تھا اور انہی کی زیر سرپرستی یہ تحریک چل رہی تھی۔ منشی عبدالرحمان خان صاحب مرحوم فرماتے ہیں:

> "اس تحریک کے بانی شردھانند کی یادگار قائم
> کرنے کے لئے کانگریسی لیڈروں پنڈت مالوی، لالہ لاجپت
> رائے وغیرہ نے دس لاکھ روپیہ کی اپیل شائع کی اور شدھی کو
> ہندو مسلم اتحاد کا نام دیا گیا، راج کمار اٹھی نے دہلی میں
> تقریر کرتے ہوئے کہا: بلا شدھی ہندو مسلم ایکتا (اتحاد)
> نہیں ہو سکتی جب تک سب مسلمان شدھ (مرتد) ہو کر
> ہندو نہ ہو جائیں۔" (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص ۲۸)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی بھی رائے تھی کہ شدھی تحریک میں گاندھی وغیرہ کا ہاتھ ہے، چنانچہ آپ نے گاندھی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

> "میں نے اسی لئے شباب تحریک میں کہہ دیا تھا
> کہ جو شخص توحید اور رسالت کا منکر ہو وہ اسلام اور

مسلمانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد ہو؟ یہ معمہ میری سمجھ میں
نہیں آتا۔ اب دیکھ لو مسلمانوں کے ساتھ اس کی خیر خواہی'
ادھر تو مسلمانوں کو حکومت کے آگے کر دیا اور ادھر شدھی
کا مسئلہ جاری کرا دیا۔ غرض ہر طرح سے مسلمانوں کے
جان و مال 'ایمان' جائیداد 'زر' زمین اور مال سب کا مالک اپنی
قوم کو بنانا چاہتا ہے۔"

(مولانا اشرف علی تھانویؒ اور تحریک آزادی ص ۳۷)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے مطابق ۱۹۳۷ء میں منعقد ہونے والے انتخابات کے نتیجہ میں متعدد صوبوں میں کانگریس برسر اقتدار آ گئی' یہ کانگریسی حکومت اس کے دعوؤں کے بارے میں ایک ٹیسٹ کیس کی حیثیت رکھتی تھی' کانگریس کا دعویٰ تھا کہ اس کا مقصد صرف انگریز کو ہندوستان سے نکالنا اور اہل ہند کی آزاد حکومت قائم کرنا ہے جس میں مسلمانوں کے حقوق کی پوری پوری رعایت رکھی جائے گی۔ ۱۹۳۷ء میں وزارتیں بنانے کے بعد کانگریس کو اپنے اس دعویٰ کی سچائی ثابت کرنے کا ایک سنہری موقع ملا تھا وہ اس سے فائدہ اٹھا کر ہندو کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکتی تھی' اگر وہ ایسا کر لیتی اور مسلمان کے سامنے ایک اچھی تصویر پیش کر دیتی اور مسلمانوں کو اپنے بارے میں مطمئن کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو مسلمان شاید مسلم لیگ کی طرف رخ بھی نہ کرتے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ کانگریس کے دو سالہ دور اقتدار میں کانگریسی ہندو لیڈروں کی ذہنیت کھل کر سامنے آ گئی' چنانچہ اسلام اور اسلامی تہذیب کے اثر و رسوخ کو کم کرنے اور مسلمانوں کی نئی نسل کو ہندوانہ رنگ میں رنگنے کے لئے ایسے اقدامات کئے جن کا آزادی ہند اور استخلاص وطن (جس کا کانگریس دعویٰ کرتی تھی) سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں تھا' بعض اقدامات پر تو خود کانگریسی مسلمان بھی چیخ اٹھے تھے۔

اردو زبان اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی آئینہ دار مسلمانان برصغیر کی رابطہ کی زبان ہے' علماء نے ہمیشہ اس کو برصغیر میں اسلامی وجود کی علامت سمجھا' حضرت تھانویؒ نے بھی اس کی حفاظت کو دین کی حفاظت قرار دیا۔ (امداد الفتاویٰ ج ۴/ص ۴۵۵) لیکن دین اسلام کے ساتھ اسی گہرے تعلق کی وجہ سے یہ زبان ہمیشہ کانگریسی اور غیر کانگریسی ہندو سیاستدانوں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی ہے' کانگریس نے بھی اپنے دور اقتدار میں اس پر نظر عنایت کی اور بقول مفتی اعظم پاکستان قدس سرہ:

"یہاں تک کہ ہندوستان کی زبان بجائے اردو
کے ہندی بنانے کی پیہم کوشش شروع کر دی اور دفتری زبان
تو جہاں جہاں بس چلا بدل بھی ڈالی۔"

(جواہر الفقہ ج ۲/ص ۲۲۸)

اسی طرح کانگریسی حکومت نے واردھا سکیم کے نام سے ایک تعلیمی سکیم جاری کی جس کا مقصد بھی بقول علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اقلیتوں پر اکثریتوں کا روغن چڑھانا تھا' اس سکیم کے ذریعے کانگریس' گاندھی کی عظمت اس کا مشترکہ قابل احترام قائد ہونا' تمام مذاہب کی صداقت و حقانیت 'گاندھی کا فلسفہ عدم تشدد جیسی چیزیں زبردستی مسلمان بچوں کے ذہنوں میں ٹھونسنا چاہتی تھی' اس پر جمعیۃ علماء ہند کا احتجاج ہم پہلے نقل کر چکے ہیں اور بھی بہت سی مسلم تنظیموں اور شخصیتوں کی طرف سے اس کے خلاف احتجاج کیا گیا لیکن کانگریس حکومت نے اس کا ذرہ برابر بھی اثر نہ لیا' اس کے علاوہ کانگریسی جھنڈے کی غیر اسلامی طریقہ سے پراتھنا (سلامی) اور مشرکانہ ترانہ بندے ماترم کی سکولوں میں ترویج (اس کے بارے میں فتویٰ ملاحظہ ہو امداد الفتاویٰ ج ۴) ودھیا مندر سکیم دیہات سدھار سکیم وغیرہ بہت سے اقدامات ہیں جن کی وجہ سے ہندو بنئے کا اصلی چہرہ کھل کر سامنے آ گیا۔

۱۹۲۷ء میں برطانیہ نے سر جان سائمن کی سربراہی میں ہندوستان کے آئینی مسائل کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیشن قائم کیا۔ کانگریس، مسلم لیگ (جناح گروپ) اور بعض دوسری جماعتوں نے اس کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ کانگریس نے آل پارٹیز کانفرنس بلائی جس میں مسلم لیگ بھی شامل ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں ایک ذیلی کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں بنائی گئی، نہرو کمیٹی میں دو مسلمان بھی شامل تھے جن کا تعلق بھی کانگریس سے تھا، اس کمیٹی کی رپورٹ پر مسلمانوں میں شدید اضطراب پیدا ہوا، اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد علی جوہر مرحومؒ (جن کی سامراج دشمنی اور استخلاص وطن کے جذبہ کے بارہ میں کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا) نے کہا:

> اس رپورٹ کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق خدا کی
> ملک وائسرائے کا اور حکومت ہندو مہاسبھا کی۔[1]
>
> (جواہر الفقہ ص ۳۲۸ / ج ۲)

"بندے ماترم" کا اوپر تذکرہ آچکا ہے، کانگریس اسے بہت زیادہ اہمیت دیتی اور اسے قومی گیت کا درجہ دے رکھا تھا جب کہ مسلمان اس پر بہت زیادہ پیچ پا تھے، یہ ترانہ کیا تھا اور اس کا پس منظر کیا تھا؟ اس کے بارے میں پروفیسر محمد منور کی کتاب "تحریک پاکستان، تاریخی خد و خال" سے ایک اقتباس نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اگرچہ ذرا طویل ہے لیکن اسی سے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے اس جملے کو سمجھنے میں مدد ملے گی کہ "غرض ہر طرح سے مسلمانوں کے جان و

---

[1] محمد علی مرحومؒ نے اپنی معروف نکتہ سنجی کو استعمال کرتے ہوئے یہ بات اس اعلان میں تھوڑا سا تغیر کرتے ہوئے کہی تھی جو مغلیہ بادشاہت کو برقرار رکھتے ہوئے اختیارات ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنبھالتے ہوئے کہا تھا، جس میں کہا گیا تھا، خلق خدا کی ملک بادشاہ سلامت کا، حکم کمپنی بہادر کا۔

مال، ایمان، جائیداد، زر، زمین اور مال سب کا مالک اپنی قوم کو منانا چاہتا ہے"۔ یہ مضمون پروفیسر محمد منور نے فضل کریم درانی مرحوم کی کتاب "The Meaning of Pakistan" سے بطور تلخیص و اختصار نقل کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تحریک پاکستان تاریخی خد و خال ص ۷۵)

> "یہ تو عیاں ہے کہ بندے ماترم بنکم چندر چٹر جی کے ناول "آنند مٹھ" کا حصہ ہے۔ یہ ناول ۱۸۸۲ء کی تصنیف ہے۔ اس کی کہانی کا پس منظر ۱۲۸ سال قبل کے سیاسی احوال ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سال ۱۷۵۴ء بنتا ہے جب پورے برعظیم پر مسلمانوں کا تسلط تھا۔ نادر شاہ کا حملہ اس سے پچیس برس بعد ہوا تھا۔ کہانی کا ہیرو بیھاو آنند ہے اور وہ مسلمانوں کے خلاف مسلح بغاوت کی تیاری کر رہا ہے۔ کسی ایسی ہی مہم کے دوران میں بیھاو آنند کی مندر سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ مندر کی اس سے شناسائی تھی اس لئے کہ کچھ ہی عرصہ قبل بیھاو آنند نے مندر کی بیوی اور بیٹی کو ڈاکوؤں سے رہائی دلائی تھی۔
>
> "بیھاو آنند، مندر کو "بندے ماترم" گا کر سناتا ہے، مندر کو مفہوم سمجھنے میں دقت ہوتی ہے، وہ دوبارہ سناتا ہے اور ساتھ ساتھ مفہوم بھی سمجھاتا ہے یہ کہ ماتا (وطن) کی آزادی کیوں ضروری ہے اور بغاوت کیوں لابد ہے۔ مندر بزدل شخص ہے وہ بیھاو آنند سے بھی کہتا ہے کہ یہ منصوبہ ناممکن العمل ہے، لہٰذا اسے ترک کر دے۔ اس پر بیھاو آنند پرجوش تقریر داغ دیتا ہے کہ "ہمارا دھرم جا چکا، ذات جا

مچی' عزت جاچکی اور اب خود زندگی بھی غیر محفوظ ہے جب تک ان مستی خورے مسلموں کو وطن سے نکال باہر نہ کیا جائے گا' ہندو اپنے ہندو مت کا تحفظ نہیں کر سکتے"۔

"مہندر پوچھتا ہے: تم مسلموں کو کیسے نکال باہر کرو گے؟ اس پر بھاو بندے ماترم کے چند مصرعے گاتا ہے جن کا ترجمہ یہ ہے:

"جب سات کروڑ گلے دھاڑیں گے اور سات کروڑ سے دگنے ہاتھ تیز دھار کی تلواریں لہرائیں گے تو کیا تمہارے خیال میں ماتا (وطن) پھر بھی کمزور ہو گی۔"

"مہندر پھر بھی مسلمانوں کی بہادری سے ڈراتا ہے مگر بھاو آنند کہتا ہے کہ مسلمان بزدل ہے' ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ بہادر انگریز ہے کہ خواہ جان ہی پر بن جائے مگر میدان نہیں چھوڑتا۔ مسلمان کا حال یہ ہے کہ ادھر پسینہ آیا اور ادھر وہ بھاگ اٹھا' اگر کہیں قریب و جوار میں توپ کا گولہ گرے تو مسلمان کا پورا کنبہ' قبیلہ خوف سے ہوا ہو جاتا ہے۔"

قارئین پر واضح ہو رہا ہو گا کہ ایک جانب مسلمان سے شدید نفرت کا بیج بویا جا رہا ہے اور دوسری جانب انگریز کی خوشامد کی جا رہی ہے۔ بہر حال بھاو آنند کی اس تقریر کے باوجود مہندر مسلمانوں کے خلاف آمادہ جنگ ہونے کا حلف نہیں اٹھاتا۔

اگلی صبح بھاو آنند مہندر کو لے کر "آنند مٹھ" کے مندر میں جاتا ہے۔ مندر کا تحویل دار ایک برہمچاری ہے' وہ مہندر کو مندر کے اندر وہاں لے جاتا ہے جہاں نیم تاریکی

ہے۔ رفتہ رفتہ جب مہندر ٹھیک سجائی دینے لگتا ہے تو اسے وشنو کا چار بازوؤں والا بڑا سا بت دکھائی دیتا ہے۔ بت بہر نوع مکمل ہے' وہ پنکھ' حلقے' عصا اور کنول سے مزین ہے' تن سے جدا اور خون آلود سر وشنو کے سامنے لڑھک رہے ہیں۔ وشنو کے بائیں ہاتھ میں لکشمی کا بت ہے' دائیں ہاتھ سرسوتی' وشنو کی گود میں ایک اور خوبصورت مورتی ہے۔

برہمچاری مہندر سے پوچھتا ہے وشنو کی آغوش میں جو مورتی ہے' تمہیں دکھائی دیتی ہے؟ مہندر جواباً پوچھتا ہے ہاں مگر یہ کس کی مورتی ہے؟ برہمچاری جواب دیتا ہے "یہ ماتا ہے" اور ساتھ ہی نعرہ لگاتا ہے "بندے ماترم"۔ گویا یہ مورتی مادر وطن کی مورتی تھی جو وطن کو ایک بت کی صورت میں پیش کر رہی تھی۔ ارد گرد اور بھی کئی بت تھے۔ ماتا کے حضور میں "بندے ماترم" گا کر ہی نذرانہ' عقیدت پیش کیا جاتا تھا۔

"اب برہمچاری مہندر کو مندر کے ایک اور کمرے میں لے جاتا ہے' وہاں جگت دھری دیوی کی فرمانروائی ہے۔ دیوی کے گرد بڑی شان و شوکت کا ہالہ ہے۔ یہاں برہمچاری وضاحت کرتا ہے کہ ماتا (ہمارا وطن) پہلے اس طرح تھی یعنی شان و شکوہ والی۔ مہندر بڑی عقیدت سے جھک کر آداب بجا لاتا ہے' وہاں سے مہندر کو ایک تاریک سرنگ میں لے جایا جاتا ہے۔ وہاں سے ایک بھورے میں جہاں کالی دیوی کا بت نظر آتا ہے' رنگ سیاہ' برہنہ' ہے

لباس۔ برہمچاری نے کہا اب ماتا کا یہ حال ہو گیا ہے۔ مہندر پوچھتا ہے مگر اس دیوی نے ہاتھوں میں یہ ہتھیار کیوں لے رکھے ہیں؟ برہمچاری کہتا ہے "ہم نے کہ اس کے بچے ہیں" اسے مسلح کر دیا ہے اور وہ ساتھ ہی مہندر سے کہتا ہے کہو "بندے ماترم"۔

"وہاں سے مہندر کو ایک اور کمرے میں پہنچایا جاتا ہے جہاں دس ہاتھوں والی درگا دیوی کا تسلط ہے۔ اب برہمچاری کہتا ہے کہ ماتا ایک روز اس طرح کی ہو جائے گی جب دشمن (مسلمان) اس کے پاؤں تلے روندا جا چکا ہو گا۔ لکشمی اور سرسوتی یہاں بھی موجود ہیں۔ اس جگہ برہمچاری ایک جذبہ بے اختیار سے ایسے منتر اور اشلوک الاپتا ہے جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے: "تم ہو درگاہ' دس ہاتھوں والی دیوی' تم ہو لکشمی کنول لہرانے والی اور تم ہو سرسوتی وہ جو علم عطا کرتی ہے' میں کورنش بجالاتا ہوں"۔

اب مہندر کے اندر انقلاب بپا ہو جاتا ہے۔ اس کے نظریات بدل جاتے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ اب میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ مسلمانوں کے خلاف مسلح بغاوت میں شامل ہوں گا۔ گویا وطن "ماتا" دو تین دیویوں کے مماثل ہے اور اس اعتبار سے اس کے حضور میں اظہار عقیدت کیا جاتا ہے۔

ناول کے حصہ دوم کے باب پنجم میں مسلمانوں کے خلاف مسلح بغاوت کرنے کی خاطر رنگروٹ بھرتی

کرنے کا منظر دکھایا گیا ہے۔ ہر رنگروٹ حلف اٹھاتا ہے کہ جب تک "ماتا" (وطن کی سرزمین) آزاد نہیں ہو جاتی میں نہ اہل خانہ سے کوئی رابطہ رکھوں گا اور نہ دنیا کی کسی اور شے سے کوئی تعلق رکھوں گا۔ میں ہتھیار سنبھالے سناتن دھرم کے لئے جنگ جاری رکھوں گا۔ ہر رنگروٹ کو جو یہ حلف اٹھاتا ہے حکم دیا جاتا ہے کہ "بندے ماترم" الاپے۔ حلف کی تکمیل بندے ماترم الاپنے سے ہوتی ہے۔

جب بہت سے رنگروٹ بھرتی ہو جاتے ہیں تو انہیں ٹکڑیوں اور جتھوں میں بانٹ دیا جاتا ہے تاکہ وہ مختلف دیہات پر حملہ آور ہوں اور مسلمانوں کو خائف اور ہراساں کریں۔ یہ "پیامی" جس بھی گاؤں میں جاتے ہیں وہاں اگر کوئی ہندو نظر آئے تو اس سے یہ کہتے ہیں: بھائی کیا تم وشنو کی پرستش کرو گے؟ وہ کہتے ہیں کریں گے اور پھر بیس پچیس ہندوؤں کا جتھا لے کر مسلمانوں کے گھروں پر چڑھ دوڑتے ہیں اور انہیں نظر آتش کر دیتے ہیں۔ مسلمان افراتفری کے عالم میں جان بچانے کی خاطر بھاگنے لگتے ہیں' اس عالم [illegible] وطن کے فرزند (اور ظاہر ہے وہ فقط ہندو ہیں) مسلمانوں کا مال و متاع لوٹ لیتے ہیں' پھر لوٹ کا مال پجاریوں میں بانٹ دیتے ہیں۔

دیہات کے یہ ہندو لوٹ کا حصہ وصول کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ ازاں بعد ان کو وشنو کے مندر میں لے جایا جاتا ہے جہاں وہ مورتیوں کے پاؤں چھوتے ہیں اور انہیں جدید عقیدت مندوں کے حلقے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ گویا واضح ہو گیا کہ

وشنو کی عقیدت اور "ماتا" کی خدمت کا مطلب ہے مسلمانوں کے گھروں پر حملہ کرنا، انہیں لوٹنا اور آگ دکھانا۔۔۔۔ بہر حال ناول کی کہانی میں قتل و غارت کے اس سلسلے کو دراز کیا جاتا ہے۔ پھر اس حصے کے آٹھویں باب میں ایک بیان اور نظر سے گزرتا ہے:

> بتایا جاتا ہے کہ بڑا جوش و خروش ہے غل غپاڑے کا محشر بپا ہے۔ اس غوغا میں جو الفاظ بلند تر آواز میں کہے جا رہے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے: "مار دو مار دو مسلوں (مسلمانوں) کو مار دو" "بندے ماترم"۔ نیز یہ کہ اے بھائیو! وہ دن بس آنے ہی والا ہے جب ہم مسلوں کو بھسم کر دیں گے، ان کے ٹھکانوں کی جگہ پر مادھو کے مندر کھڑے کریں گے، ساتھ ساتھ "بندے ماترم" کی بلند آہنگ للکار سنائی دے رہی ہے۔

اب ہم تیسرے حصے کے چھٹے باب پر آتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریز بھی باغیوں کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ بنکم چندر چٹرجی لکھتا ہے:

> "جنگل اور وادیاں بندے ماترم کی للکار سے گونج رہی ہیں اور وشنو کا ہر سپاہی گا رہا ہے: تمہی علم ہو، تمہی عبادت ہو، تمہی دونوں بازوؤں کی طاقت ہو اور تمہی میرے اس بدن کی جان ہو۔"

یہ الفاظ گیت "بندے ماترم" کے تین مصرعوں کا ترجمہ ہے۔ آخری باب میں ایک مرد حکیم و طبیب اور باغیوں کا ایک سرغنہ ستیانند آپس میں باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں، گفتگو کا ماحول اداس اداس ہے، ستیانند کہتا ہے:

> مسلمانوں کی قوت پامال کر دی گئی ہے مگر ہندو

> راج تو قائم نہیں ہوا، کلکتہ پر تو انگریز کی حکمرانی ہے۔ مرد حکیم کہتا ہے: ابھی مندر کا تسلط قائم نہیں ہو گا۔ ستیانند چلا اٹھتا ہے میرے آقا تو کیا دوبارہ مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو جائے گا؟ مکالمہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ وہ مرد حکیم اچانک ایک فوق الانسان وجود کا روپ دھار لیتا ہے اور پھر دلجوئی کے لہجے میں باغیوں سے کہتا ہے:

> اب کوئی دشمن باقی نہیں رہ گیا، انگریز ہمارے دوست ہیں اور جب انگریز جائیں گے تو ہمارا تسلط قائم ہو جائے گا۔ کہانی کی رو سے گویا ہندو کو اصل عداوت انگریز سے نہ تھی، ہندو کے بغض کا سارا جوش و خروش مسلمانوں ہی کے خلاف عمل میں آ رہا تھا اور انگریز کے بعد مسلمانوں کو نابود کر کے ہندو راج قائم کرنے کا خواب دیکھا جا رہا تھا۔

مذکورہ بالا تفصیل کے بعد یہ جاننا مشکل نہیں رہا کہ "مسلمان بندے ماترم" کو اپنے خلاف اعلان جنگ کیوں سمجھ رہے تھے اور کانگریس اسے اتنی اہمیت کیوں دے رہی تھی، اس سے کانگریسی ہندوؤں کے عزائم اور ان کی سوچ کو سمجھنا مشکل نہیں رہتا۔ اس سے زیادہ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ قائداعظم کے "بندے ماترم" پر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا "قومی ترانے عوام کے جذبات سے پھوٹتے ہیں وہ فرمائش پر تیار نہیں کئے جاتے۔" (تحریک پاکستان، تاریخی خد و خال ص ۸۱) جس کا مطلب یہ ہوا کہ نہرو صرف ہندو سوچ ہی کو عوامی جذبات سمجھتے تھے اور اس کے خلاف تمام مسلمانوں کی چیخ و پکار اس کی "عوامیت" کے منافی نہیں تھی، اس سے اس "عوامی لیڈر" کی سوچ کا با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

گاندھی اپنی قوم کو کس طرح ہر چیز کا مالک بنانا چاہتا تھا اس کا اندازہ

اچھوتوں کے بارے میں اس کے طرز عمل سے لگایا جا سکتا ہے' اس نے ہریجنوں اور اچھوتوں کی بھلائی کے لئے زبانی کلامی اگرچہ بہت کچھ کہا' لیکن عملی امتحان نے ہمیشہ اس کی منافقت کو بے نقاب کیا۔ دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۱ء) کے موقع پر مسلمان ہریجنوں کو زیادہ حقوق دلوا رہے تھے' گاندھی کا رویہ خود ایک اچھوت لیڈر منڈل کی زبانی سنئے :

> "دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر مسلمانوں نے اچھوتوں اور عیسائی اقلیتوں کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کئے۔ مسٹر گاندھی نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا یہاں تک کہ مسٹر جناح کے چودہ نکات کو بھی قبول کر لینے کی پیش کش کر دی فقط اسی شرط پر کہ مسلمان ہریجنوں کے جداگانہ حق انتخاب کے مطالبے کی مخالفت کریں مگر عظیم مسلمان قوم قابل داد ہے کہ انہوں نے ہریجنوں کے ساتھ بے وفائی کرنے سے انکار کیا اور اپنے دستخطوں سے منحرف نہ ہوئے۔"

(تحریک پاکستان' تاریخی خدوخال ص ۹۵)

۱۹۳۲ء میں جب Communal Award (فرقہ وارانہ فیصلہ) کا اعلان ہوا اور اس میں اچھوتوں کو عام ووٹ (جس میں وہ ہندوؤں کے ساتھ ہی شامل تھے) کے علاوہ جداگانہ انتخاب کا بھی حق دیا گیا تو اس کے خلاف بھی گاندھی نے "مرن برت" رکھ لیا' (حوالہ سابقہ ص ۹۷) حالانکہ اس میں ہندوستان کا کوئی نقصان نہیں تھا بلکہ صرف ہندوؤں بلکہ ان کی بھی صرف اونچی جات کا نقصان تھا' گاندھی وغیرہ کو اچھوتوں کی مسلم لیگ یا مسلمانوں کی قربت سے بھی خطرے کی بو آ رہی تھی اس لئے اچھوتوں کی نشستوں کا تحفظ اسے گوارا نہیں تھا۔ ایک طرف یہ صورت حال تھی اور

دوسری طرف سارا زور یہ باور کرانے پر لگایا جا رہا تھا کہ کانگریس تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہے اور گاندھی سب کے متفقہ مفکر اور "قائد اعظم"۔

یہاں حالات و واقعات کا استقصاء مقصود نہیں اور نہ ہی احقر کو اس سلسلے میں زیادہ واقفیت کا دعویٰ ہے صرف ہندو ذہنیت کی تھوڑی سی جھلک دکھانی مقصود ہے' یہ سب اس دور کی باتیں ہیں جب کہ ہندو کو اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے سوراج (آزادی) کے نام پر مسلمانوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔

اصل مسئلہ دیسی بدیسی کا نہیں اسلام اور کفر کا تھا

ان حالات و واقعات سے اسی طرح بعد از تقسیم کے حالات نے حضرت حکیم الامتؒ کے اس نظریہ کی تائید کر دی کہ ہندو انگریز سے کم خطرناک نہیں۔ انگریزی غلامی کا جوا اتار کر ہندو اکثریت کو اپنے اوپر مسلط کرنے کے لئے اتنی جدوجہد مناسب نہیں' دراصل حضرت حکیم الامتؒ نے انگریزی اقتدار کے بارے میں دیسی بدیسی ملکی غیر ملکی کے حوالے سے نہیں سوچا بلکہ آپ کے نزدیک اصل مسئلہ اسلام اور کفر کا تھا' آپ کے نزدیک بھی انگریز حکومت بری تھی لیکن اس وجہ سے کہ وہ کافر ہے اس وجہ سے نہیں کہ وہ غیر ملکی ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی جو خود بھی سیاسی امور میں حضرت سے اختلاف رکھتے تھے اور آپ کے بارے میں بعض غلط فہمیوں کا شکار تھے حضرت سے اپنی پہلی ملاقات کا حال ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "۱۹۲۸ء تھا مخاطب روزنامہ "ہمدرد" کا ڈائریکٹر تھا' صبح اور دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں

پر گفتگو آجانا۔۔۔۔۔ ناگزیر تھا گفتگو آئی۔ حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرت "گورنمنٹی" آدمی ہیں لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ جس نے بھی ایسا کہا جان کر یا بے جانے بہر حال جھوٹ ہی کہا۔ یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی مسلمان بھی ایسا جو جوشِ دینی اور غیرتِ ملی میں کسی "خلافتی" سے ہرگز کم نہیں۔ پاکستان کا تخیل، خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑی۔ بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریق کار سے پورا اتفاق نہ تھا لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں نفسِ مقصد یعنی حکومت کافرانہ سے خلاصی اور دار الاسلام کے قیام میں تو حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے، عجب نہیں جو کچھ آگے ہی ہوں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا، حضرت کو حکومت وقت سے جو مخالفت تھی وہ اس کے کافرانہ ہونے کی بناء پر تھی نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بناء پر۔"

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص ۳۸)

ایک موقع پر آپؒ نے ارشاد فرمایا:

"بعض حضرات کی رائے ہے کہ کفار سے استخلاص وطن ضروری ہے۔ میں نے کہا یہ بالکل صحیح ہے مگر یہ کون سی کتاب میں لکھا ہے کہ کفار سے مراد ایک ہی قوم ہے دوسری قوم تو بہت پکی مسلمان ہے اور اس سے استخلاص

وطن ضروری نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ پہلی قوم سے زیادہ دوسری قوم مسلمانوں اور اسلام کی سخت دشمن ہے۔"

(مولانا تھانویؒ اور تحریک آزادی ص ۳۲)

اسی طرح آپ نے فرمایا:

"جب تک ہم کلمہ پڑھتے ہیں تمام غیر مسلم ہمارے دشمن ہیں اس میں کالے گوروں کی کچھ قید نہیں۔"

(اصلاح المسلمین ص ۵۱۶)

یہ صحیح ہے کہ الکفر ملۃ واحدۃ کے باوجود کافروں کی ایک جماعت کے مقابلہ کے لئے دوسری جماعت کے ساتھ صلح کی جاسکتی ہے لیکن کانگریس میں شرکت پر یہ اصول منطبق نہیں ہوتا تھا اس لئے کہ اول تو یہ اصول تب ہے کہ جب اس اشتراک میں حکم اسلام غالب ہو اور کافر تابع ہو۔

دوسرے جس طرح کی آزادی کا مطالبہ کانگریس کر رہی تھی اس کے مطابق اہل ہند کی ایک جمہوری حکومت قائم ہوتی جس میں یقیناً ہندو کو غلبہ ہوتا اور ہندو کا مسلمانوں پر تسلط انگریز سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا۔ ایک تو اس لئے کہ ہندو کے دل میں مسلمانوں کی صدیوں محکومیت کی وجہ سے ان کے خلاف بغض و عناد بھرا ہوا تھا، وہ عالمگیر جیسے سلاطین اسلام کا بدلہ لینا چاہتے تھے، دوسرے انگریزی قوت چونکہ اس خطے کی اصل باسی نہیں تھی اس لئے بد[illegible]ی کبھی نہ کبھی اس سے نجات ممکن ہی تھی لیکن ہندو قوم تو یہیں کی رہنے والی اکثریتی قوم اور سرزمین ہند کی سب سے زیادہ حق دار بلکہ واحد مقدار ہونے کی مدعی تھی، اس کی اکثریتی حکومت کے مظالم سے نجات کیسے ممکن ہوتی، یہ تو جان لیوا مار آستین ثابت ہوتی۔ چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا:

"کافر جتنے ہیں سب اسلام کے دشمن ہیں کوئی

گورا ہو یا کالا دونوں سانپ ہی ہیں بلکہ گورے سانپ سے کالا
سانپ زیادہ زہریلا ہوتا ہے' اگر گورے سانپ کو گھر سے
نکال بھی دیا تو کالا ڈسنے کو موجود ہے جس کا ڈسا ہوا زندہ رہنا
مشکل ہے۔ (حوالہ سابقہ ص ۵۱۷)

کانگریس کی حمایت کرنے والے اکابر رحمۃ اللہ علیہم کی رائے یہ تھی کہ ان حالات میں فرنگی سامراج سے نجات حاصل کرنا اصل مسئلہ ہے اور مسلمانوں کے حقوق و مفادات اور ہندو عزائم سے ان کا تحفظ ثانوی مسئلہ' مسلمانوں کے مفادات کے سوال کو استخلاص وطن میں تاخیر کا باعث نہیں بننے دینا چاہئے۔ چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ نے اس سوال کو بعد کا مسئلہ قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"باقی رہا ان مفادات کا حاصل کرنا جن کو آپ یا
کوئی دوسری جماعت مسلمانوں کے لئے مستقبل میں مفید یا
ضروری سمجھتے ہیں یہ بعد کا مسئلہ ہے دفع ضرر جلب منفعت
سے مقدم ہے' اگر گاؤں میں آگ لگی ہے تو پہلے آگ بجھائیے
پھر اپنی زمینوں کی تقسیم کا فیصلہ کیجئے' اگر آپ مریض ہیں تو
پہلے مرض کو دفع کیجئے پھر تقویت کی فکر کیجئے گا۔"

(مکتوبات شیخ الاسلامؒ ج ۲ / ص ۱۰۶)

یہ حضرت مدنی وغیرہ کی ایک دیانت دارانہ رائے تھی جس کا منشا اخراج انگریز کا بے پناہ جذبہ تھا جو تقریباً آپ کا حال بن چکا تھا' جب کہ دوسری طرف کے اکابر کی رائے یہ تھی کہ آزاد برصغیر میں مسلمانوں کے مفادات کا سوال بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ انگریز سے نجات حاصل کرنے کا' یہ مسئلہ طے کئے بغیر آزادی کی جدوجہد آگ بجھانا نہیں بلکہ ایک آگ کی جگہ دوسری اس سے بھی زیادہ خطرناک آگ لگانا ہے جس کو بجھانا شاید صدیوں تک ممکن نہ ہوتا' اس طرح کی آزادی مرض کا علاج نہیں

بلکہ ایک مرض کی جگہ اپنے آپ کو دوسرا دائمی روگ لگانا اور سامراج کی جگہ رام راج کو مسلط کرنا تھا۔ اس لئے کہ یہ آگ بدیسی اور باہر سے پھینکی جانے والی نہ ہوتی بلکہ اپنی ہی سرزمین سے نکلنے والی اور وطنیت کے شرف سے مشرف ہوتی۔

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ مجوزہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی مؤثر نمائندگی کے لئے ایک فارمولا طے کر لیا گیا تھا چنانچہ مکتوبات شیخ الاسلامؒ کے مرتب اور محشی مولانا نجم الدین اصلاحی فرماتے ہیں:

"جمعیۃ علماء ہند اور قوم پرور مسلمانوں نے جو
فارمولا کانگریس کے سامنے پیش کیا تھا اور اگست ۱۹۴۶ء
کے اجلاس میں کانگریس نے تقریباً اس کو منظور بھی کر لیا
تھا۔" (مکتوبات ج ۲ / ص ۹۵)

لیکن ان فارمولوں کی حیثیت محض وعدہ اور معاہدہ کی تھی محض کانگریس کی منظوری سے وہ بھی "تقریباً منظوری سے" "واجب العمل قانون نہیں بن گیا تھا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مستقل دستور سازی کی ضرورت تھی' یہ کام یا تو انگریز ہندوستان چھوڑنے سے پہلے کر سکتا تھا یا پھر یہ معاملہ انگریز کی جانشین کانگریس حکومت کے ہاتھ میں ہوتا' دونوں کی مکاری' عیاری اور وعدہ خلافی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

یہ بیسویں صدی کی سیاست ہے جو تمام اخلاقی اقدار سے بالاتر ہے اس میں وعدوں معاہدوں کی حیثیت واضح ہے' بالخصوص ہندو بنیا تو اپنی عیاری اور مکاری کے لئے مشہور ہے' اس نے اقوام متحدہ میں اقوام عالم کے سامنے کشمیر میں استصواب رائے کا وعدہ کیا تھا لیکن آج تک امت مسلمہ اور انصاف و امن پسند دنیا اس کی عملی تصویر دیکھنے کو ترس رہی ہے' اسی کانگریس کی جانشین ہندوستان کی موجودہ مرکزی حکومت نے بابری مسجد کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا جس کے ایفاء کی امت مسلمہ متمنی

تھی لیکن اس نے اس موقع پر مجرمانہ غفلت کا ثبوت دے کر اپنی اخلاقی اور آئینی ذمہ داریوں کا جو حشر کیا وہ سب کے سامنے ہے' ایسی قوم کے وعدوں پر اس وقت اعتماد کر لینا تو کسی حد تک سمجھ میں آنے والی بات تھی' لیکن بعد کے حالات دیکھنے کے بعد اس مکار قوم کے "تقریباً" منظور کئے ہوئے فارمولوں کو یاد کرتے رہنا اور مسلم لیگ کی طرف سے نفاذ اسلام کے وعدوں پر جزوی سے اعتماد کو سادہ لوحی اور سیاسی معاملات سے ناواقفیت قرار دینا بالکل ناقابل فہم ہے' پھر اس فارمولے کے بعض نکات ایسے تھے جن کا مطالبہ سائمن کمیشن کی آمد پر نہرو رپورٹ کے موقع پر (جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے) مسلم لیگ نے کیا تھا (مثلاً غیر مصرحہ اختیارات (Residuary Powers) صوبوں کو تفویض کئے جائیں) لیکن اس وقت ان مطالبات کو قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں جب مسلم لیگ کا جادو کانگریس کے سر پہ چڑھ کے بولنے لگا اور حالات کانگریس کے ہاتھ سے نکلتے دکھائی دینے لگے تو مسلمانوں کو مسلم لیگ اور نظریہ پاکستان سے دور رکھنے کی آخری کوشش کے طور پر مسلمانوں کے بعض مطالبات کو "تقریباً منظور" کر لیا گیا' قرآن کریم نے مشرکین مکہ کے بارے میں فرمایا:

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ۔

ترجمہ:- کیسے (ان کا عہد قابل رعایت رہے گا) حالانکہ ان کی حالت یہ ہے کہ اگر وہ تم پر کہیں غلبہ پا جائیں تو تمہارے بارے میں نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول قرار کا' یہ لوگ تم کو صرف اپنی زبانی باتوں سے راضی کر رہے ہیں اور ان کے دل نہیں مانتے اور ان میں زیادہ آدمی شریر ہیں۔ (بیان القرآن)

مشرکین مکہ سے کہیں زیادہ عیار و مکار مشرکین ہند کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لیں اور اس آیت پر بار بار غور کریں یہ سچی کتاب کس طرح آج مشرکین پر بھی

صادق آ رہی ہے۔

بعض حضرات متحدہ ہندوستان پر اس لئے زور دے رہے تھے کہ اس سے دوسرے مسلم ممالک کی آزادی کی راہ ہموار ہو گی' ایک تو اس لئے کہ تقسیم ہند کی کوشش کی صورت میں انگریز کے جنگ عظیم کے بعد اکھڑے ہوئے قدم ہندوستان میں دوبارہ جم جائیں گے اس صورت میں مسلم ممالک کی آزادی کا راستہ بھی مسدود ہو جائے گا' دوسرے اس لئے کہ ہندوستان کی ایک متحدہ مرکزی حکومت زیادہ مضبوط ہو گی اور ہندوستان کی مضبوط مرکزی حکومت سے دوسرے مسلم ممالک بھی فائدہ اٹھائیں گے اور ان کی غلامی کی زنجیریں بھی کٹ جائیں گی لیکن متحدہ ہندوستان کی حمایت میں یہ دلیل بھی کوئی زیادہ وزنی ثابت نہیں ہوئی' ایک تو اس لئے کہ بعد کے مشاہدہ نے یہ ثابت کر دیا کہ تقسیم ہند اسلامی ممالک کی آزادی کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں' قیام پاکستان کے باوجود اسلامی ممالک نہ صرف یہ کہ آزاد ہوئے بلکہ آزاد ہو کر بہت سے ممالک برطانوی اور امریکی بلاک کے حریف روسی بلاک سے منسلک رہے پاکستان اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہیں بنا۔ دوسرے شاید بعض حضرات اپنے اخلاص و وفا کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ کانگریس سے تعلق رکھنے والے ہندو قائدین بھی مغربی سامراج کی مخالفت میں اتنے ہی مستقل اور مخلص ہیں جتنے ہم' انہیں یہ توقع تھی کہ آزاد متحدہ ہندوستان کی مرکزی حکومت دنیا بھر میں مغربی سامراج کے دشمنوں کی حمایت کرے گی (اس مقصد کے لئے ایشیا اور دوسری مشرقی طاقتوں کا بلاک قائم کرے گی) لیکن دوسری طرف کے اکابر اس توقع کو خوش فہمی سمجھتے تھے' چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ومن اخبركم ان الجمهورية التي
تقوم بارضكم بعد سلطنة النصارى لا

تکون عوناً لهم علی اهل الاسلام ولا طالبة
للغلبة والعلو علی بلاد المسلمین."

(اعلاء السنن ج ۱۲/ص ۲۵۱)

"آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ تمہاری اس سر
زمین میں جو جمہوریت انگریزوں کے بعد قائم ہو گی وہ
مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی مدد گار نہیں ہو گی یا وہ
مسلمان ملکوں پر غلبہ اور بالادستی کی طلب گار نہیں ہو گی۔"

حضرت عثمانی رحمہ اللہ کی یہ سیاسی فراست تھی کہ جو بات انہوں نے ایک
احتمال اور خدشے کی شکل میں کہی تھی وہ حقیقت بن کر سامنے آگئی' ہندو انگریز اتحاد
(جو حیثیت اس وقت انگریز کی تھی وہ بعد میں امریکہ نے اختیار کر لی ہے) اتحاد کے
اس امکان کی طرف حضرت حکیم الامتؒ نے بھی توجہ دلائی تھی بلکہ اس کا سبب
بھی بیان فرما دیا تھا چنانچہ آپ نے فرمایا:

"اور (انگریز) ایک بات یہ بھی سمجھتے ہیں کہ
ہندوؤں کا ان کے ساتھ اختلاف محض مطالبات سیاسی کے
لئے ہے اگر وہ پورے کر دیئے جائیں اختلاف ختم ہو جائے گا
اور مسلمانوں کا اختلاف مذہبی ہے وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔"

(اصلاح المسلمین ص ۵۱۷)

چنانچہ خود گاندھی نے ایک موقع پر ہندوستان کی مکمل آزادی کی صورت
میں انگریز اور اتحادیوں کے ساتھ تعاون کا عندیہ دیتے ہوئے کہا تھا:

"(مکمل آزادی ملنے پر) ہندوستان کی اداسی اور
بے اطمینانی گویا جادو کے سے عمل کے تحت سرشاری اور دلی
آمادگی میں تبدیل ہو کر اتحادیوں کو تعاون پیش کرے گی

تاکہ وہ اپنی آزادی کے استحکام اور بقاء کے لئے کام کر
سکیں۔" (تحریک پاکستان' تاریخی خدوخال ص ۱۸۰)

ہندوستان کی مکار کانگرسی حکومت نے عربوں کو ہمیشہ یہ دھوکا دیا کہ وہ
شرق اوسط میں سامراجی غنڈہ گرد اسرائیل کا سخت مخالف اور اس معاملے میں عربوں
کا حمایتی ہے لیکن اب بھارت اسرائیل اور بھارت امریکہ گٹھ جوڑ کھل کر سامنے آ گیا
ہے' خلیجی جنگ میں عراق کے خلاف اس کا منافقانہ رویہ بھی واضح ہے۔ بھارت ہمیشہ
(بالخصوص روس کی ٹوٹ پھوٹ تک) اپنے امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو
چھپانے کی کوشش کرتا رہا ہے ورنہ ہر معاملے میں اس نے روس سے بھی تعاون
حاصل کیا اور امریکہ و اسرائیل سے بھی۔ ؎

اسی طرح اسرائیل بھی پاکستان کو ہمیشہ اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا
رہا اور اسے کمزور کرنے کے لئے بھارت کے ساتھ تعاون کرتا رہا ہے' مجاہدین کشمیر
کے خلاف اس کا فنی تعاون' پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر بھارت اسرائیل مشترکہ
حملوں کی کوششیں وغیرہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں' مزید بصیرت کے لئے نوائے
وقت اگست ۱۹۹۸ء کی درج ذیل خبر کا مطالعہ مفید ثابت ہو گا:

؎ احقر کو یاد پڑتا ہے کہ کچھ عرصہ قبل اخبارات میں یہ انکشاف شائع ہوا تھا کہ بھارت نے
آزادی کے کچھ ہی عرصہ بعد امریکہ سے خفیہ دفاعی معاہدے کر لئے تھے' پاک بھارت جنگوں
میں امریکہ کی طرف سے پاکستان کو جو دھوکے دیئے گئے اسی طرح خلیجی جنگ میں بھارت کا
کردار اسی کا نتیجہ تھا' اب تو یہ تعلقات کھل کر سامنے آگئے ہیں مگر افسوس ہے کہ جہاد افغانستان
اور جہاد کشمیر کی مخالفت کرنے والا طبقہ جو سامراج دشمنی کو اپنے لئے "ٹریڈ مارک رجسٹرڈ" سمجھتا
ہے وہ ابھی تک اپنی اس پرانی ضد پر قائم رہا ہے کہ پاکستان ایک سامراجی اور بھارت سامراج
دشمن ملک ہے۔

لاہور (انٹر نیشنل ڈیسک) بھارتی حکومت اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ ہندوستان اور اسرائیل کے درمیان ایٹمی تعاون گزشتہ ۲۰ برسوں سے جاری ہے۔

ایک بھارتی اخبار "ہند سماچار" نے پریس ایشیا کے سیاسی نامہ نگار کی خاص رپورٹ کے عنوان سے مزید لکھا ہے کہ مختلف برطانوی اخبارات کی رپورٹوں میں اس تعاون کا انکشاف ہونے پر اسرائیل کے سرکاری ذرائع نے بھارت کے ساتھ ایٹمی تعاون کی خبروں کو بے بنیاد قرار دیا۔ "ہند سماچار" نے لکھا ہے کہ اسرائیل کے فوجی کمانڈر کے مجوزہ دورہ بھارت کو منسوخ کرنے کی وجہ بھی یہی بتائی جارہی ہے کہ اسرائیل کسی طرح بھی اس "غلط رجحان" کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا۔ بھارتی اخبار نے لکھا ہے کہ "لیکن حقیقت اس سے بھی مختلف ہے"۔ ہند سماچار کے مطابق اسرائیلی اخبارات نے لکھا ہے کہ بھارت اور اسرائیل کے درمیان دفاعی تعاون کی تجویز مثبت شکل اختیار کر رہی ہے ہفتہ بھر پہلے اسرائیلی اخبار ہیرچ نے لکھا تھا کہ نئی دہلی میں مقیم پالیسی ریسرچ کے پروفیسر برہما جیلانی نے مئی میں اسرائیل کا سفر کیا تھا۔ بھارت کے ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالکلام نے کئی مرتبہ اسرائیل کا دورہ کیا تھا اور بہت سے سینئر اسرائیلی سائنسدان بھی بھارت کے سفر پر آتے رہے ہیں۔ ہند سماچار نے لکھا ہے کہ اسرائیلی فرموں نے بھارت کو جدید ترین فوجی مشینری دی۔ اب اسرائیلی اخبار بھی لکھ رہے ہیں کہ بھارت اور

اسرائیل ایٹمی تعاون کے علاوہ ایک دوسرے کو دفاعی ساز و سامان بھی دیتے آرہے ہیں۔

۱۲ جولائی ۱۹۹۸ء کو نوائے وقت نے اپنے انگلش سیکشن میں ایک بھارتی انگریزی اخبار سے سروش بانا کا ایک مضمون نقل کیا ہے جس کے شروع میں اسرائیل کی طرف سے انڈیا کو انتہائی تیز رفتار اور طاقتور بحری جنگی جہاز ملنے اور ٹیکنالوجی کی منتقلی کے معاہدے پر دستخط کو بھارت اسرائیل فوجی تعلقات میں ایک تاریخی پیش رفت قرار دیا ہے۔

اس پر یہ کہا جاتا تھا کہ متحدہ ہندوستان میں جو حکومت قائم ہوگی وہ جمہوری ہوگی گو ہندو اکثریت میں ہوں گے لیکن بہر حال مسلمانوں کا بھی ایک تناسب ہوگا جس کی وجہ سے خارجی امور میں فیصلے مسلمانوں کی مرضی و منشاء کے بغیر نہیں ہو سکیں گے۔

اس کے متعلق بھی حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے اس دور کی سیاست کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بڑی عجیب بات فرمائی:

"فمن المشاهد أن الجمهورية لا تبقى جمهورية بل تتبدل ملوكية عاضة قاهرة۔" مشاہدہ یہ ہے کہ جمہوریت، جمہوریت ہی نہیں رہتی بلکہ کاٹ کھانے والی جابر ملوکیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

واقعی آج کل عموماً جسے جمہوریت کہا جاتا ہے وہ درحقیقت نام نہاد اکثریت کی آمریت کا نام ہے، پھر اس ہندو اکثریت کی حمایت اور اقلیت کی مخالفت میں بڑی طاقتوں کی طرف سے اپنا وزن ڈالنے کے بعد تو خیر کے فیصلوں کی توقع اور بھی کم ہو جاتی ہے۔

حاصل یہ کہ حضرت تھانویؒ اور ان کے نقطہ نظر سے اتفاق رکھنے والے بے شمار علماء کے نزدیک کانگریس میں شرکت فقہی لحاظ سے تو ناجائز تھی ہی

مسلمانوں کی مصالح کے بھی خلاف تھی' اسی طرح یہ حضرات متحدہ جمہوری ہندوستان کو بھی مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں سمجھتے تھے۔

(۳) کانگریس وطنی قومیت اور دوسری فکری گمراہیوں کا باعث بن رہی تھی

پھر کانگریس میں شرکت اور اس کی حمایت کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ اس سے مسلمانوں میں بہت سی خطرناک قسم کی گمراہیاں پیدا ہو رہی تھیں' گو حضرت اقدس مدنی قدس سرہٗ جیسی صحیح الفکر شخصیات بھی کانگریس میں موجود تھیں جن کے بارے میں حضرت تھانویؒ نے بھی فرمایا تھا کہ باوجود سیاسی مسائل میں اختلاف رکھنے کے کوئی کلمہ خلاف حدود شرع ان سے نہیں سنا گیا۔ (مولانا تھانوی اور تحریک آزادی ص ۸۲)

لیکن ایسی شخصیات بہت کم تھیں پھر لیڈر قسم کے لوگ بھی ایسے حضرات کو ان کے مقام کے لائق اہمیت نہیں دیتے تھے حضرت تھانویؒ نے بھی اس کی شکایت کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا:

> "جو نرے لیڈر ہیں ان کے نام اور کارنامے اخبارات میں چھپتے ہیں اور مولوی صاحب دہلوی اور مدنی صاحب اس قدر کام کرتے ہیں ان کا نام تک نہیں۔"
>
> (مولانا اشرف علی تھانویؒ اور تحریک آزادی ص ۸۱)

کانگریس کی تحریک کے بڑے نظریاتی ستون دو تھے ایک سیکولر ازم دوسری قومیت و وطنیت' پوری کانگرسی سیاست انہی دو نقطوں کے گرد گھومتی تھی' سیکولر ازم اور وطنی قومیت کے نظریات سے جتنا نقصان اسلام کو پہنچا ہے شاید ہی

کسی اور چیز سے پہنچا ہو' یہ عجیب بات ہے کہ یہ دونوں نظریئے اسی مغربی سامراج کے پیدا کردہ اور پروردہ ہیں جس کی مخالفت کا کانگریسی مسلمان دعویٰ کر رہے تھے۔ یہی وہ سبق ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کی وحدت اور مرکزیت کی آخری نشانی خلافت عثمانیہ کو ختم کیا گیا تھا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی دامت برکاتہم نے اپنی معروف کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (ص ۲۷۸ تا ۲۸۲) میں تفصیل سے یہ ثابت فرمایا ہے کہ وطنی قومیت یورپ میں اس وقت پیدا ہوئی جب وہاں عیسائیت کا اثر و رسوخ کم ہوا' اب عیسائی دین اور قومیت کی حیثیت ترازو کے دو پلڑوں کی ہو گئی تھی' ایک کے ہلکا ہونے سے دوسرے کا وزنی ہونا ایک طبعی امر ہے۔ چنانچہ مذہب کا پلڑا ہلکا اور قومیت کا پلڑا وزنی ہوتا رہا یہاں تک نوبت پہنچی کہ جرمن کے ایک پروفیسر نے (بائبل کے عہد قدیم میں لکھے ہوئے حضرت ابراہیم' حضرت اسمٰعیل اور اسحٰق علیہم السلام وغیرہ کے قصوں کے بارے میں) کہا کہ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے ہم اپنی اولاد کو ایک اجنبی قوم کی تاریخ پڑھائیں' بلکہ بعض نے تو حضرت مسیح علیہ السلام سے اظہار برأت شروع کر دیا اس لئے کہ وہ جرمن نہیں تھے بلکہ اسرائیلی تھے اور جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے محبت و عقیدت کا رشتہ نہیں توڑنا چاہتے تھے انہوں نے یہ ثابت کرنا شروع کر دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسرائیلی یا سامی نسل سے تعلق نہیں تھا بلکہ آپ

آریائی نسل سے تھے' گویا قومیت کی ابتداء مذہب کی کمزوری
سے ہوئی اور اس نے آ کر مذہب کو مزید نقصان پہنچایا۔

حضرت مولانا ندوی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ قومیت اور وطنیت کا بیج جب کسی سر زمین میں ڈال دیا جاتا ہے تو وہ بہت جلدی پھلتا پھولتا ہے اور اس کی جڑیں زمین میں گہری ہوتی چلی جاتی ہیں' آہستہ آہستہ وہ ایسا درخت بن جاتا ہے جو پوری قوم پر سایہ فگن ہوتا ہے۔

وطنی قومیت کی یہ وباء جو اس دور کی سب سے خطرناک وباء ہے اسلامی ملکوں میں بھی آئی بلکہ لائی گئی۔ قومیت کے اس سیلاب نے جو اپنے ساتھ لادینیت (سیکولرازم) اور بعض اوقات اشتراکیت کو بھی لایا اسلامی افکار و نظریات' دینی اقدار اور حاملین دین کے ساتھ جو کچھ کیا (اور اب تک کیا جا رہا ہے) وہ ایک لمبی اور درد انگیز داستان ہے جس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے' سب سے پہلے لادینیت اور قومیت کا تجزیہ ترکی میں کیا گیا' جس کی بنیاد ضیاء گوک الپ جیسے لوگوں کی تحریروں نے رکھی۔ گوک الپ اور اس کے ہم فکر لوگ اسلام کی بجائے قدیم طورانی تہذیب کے احیاء کے قائل تھے' ان لوگوں کا یہ بھی اعتقاد و ایمان تھا کہ (نعوذ باللہ) عربوں کا وضع کردہ اسلام ہمارے حالات کے مناسب نہیں' ان لوگوں نے مغربی تہذیب کے اختیار کرنے پر بھی زور اس لئے دیا کہ وہ دراصل اس قدیم تمدن کے امتداد و تسلسل کی ایک شکل ہے جس کی نشوونما اور حفاظت میں ترکوں کا حصہ رہا ہے۔ (ملاحظہ ہو' ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین الباب الرابع الفصل الثانی اور مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش ص ۶۱) پھر مصطفیٰ کمال کے ذریعے جب ان نظریات کو عملی شکل دی گئی تو دین اور اہل دین کے خلاف کون کون سے جابرانہ اور ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کئے گئے اور کس طرح ہر اس چیز کے خلاف اعلان جنگ ضروری سمجھا گیا جس سے اسلام کی بو بھی آتی تھی یہ ایک مستقل موضوع ہے حتیٰ

کہ ترکی زبان جو صدیوں سے عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اس کو بھی لاطینی رسم الخط (جس میں انگریزی وغیرہ زبانیں لکھی جاتی ہیں) میں تبدیل کر کے عربی حروف کو ممنوع قرار دے دیا تاکہ نئی نسل ترکی کا رشتہ اپنے مسلمان اسلاف اور ان کے تصنیفی ورثے سے مکمل طور پر کٹ جائے۔

اسی طرح عرب قوم پرستی کا کھیل شام اور عراق میں حزب البعث العربی الاشتراکی کے ہاتھوں کھیلا گیا' حافظ الاسد اور صدام حسین نے حزب البعث کے لادینی منشور کے نفاذ کے لئے دین اور اہل دین کے ساتھ جو سلوک روا رکھا' ریاستی امور میں دین کی اتباع کی بات کرنے والوں کو جن مظالم کا نشانہ بنایا اور جبر و تشدد کی جو نایاب مثالیں قائم کیں' دینی ذہنیت کی بیخ کنی اور عرب قومیت اور بد دینی کی تخم ریزی کے لئے جس طرح آزادیاں سلب کی گئیں ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں' یہی کچھ جمال عبد الناصر نے مصر میں کیا تھا' اس کا پیش کردہ المیثاق الوطنی اپنی بنیادی سوچ میں حزب البعث کے دستور سے مختلف نہیں تھا۔

یہ مثالیں پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سیکولرازم اور وطنی قومیت کے معجون مرکب نے دین اور اہل دین کو شدید ترین نقصان پہنچایا اور ایسے خطوں میں پہنچایا جہاں کی اکثر آبادی مسلمان تھی اور جہاں اسلام کی جڑیں بہت پرانی اور گہری تھیں' ترکی صدیوں تک عالم اسلام کا مرکز اور قائد رہا ہے' اس نے عالم اسلام پر دشمنوں کی طرف سے ہونے والی بہت سی یلغاروں کا مقابلہ کیا تھا' مصر خلافت فاروقی میں صحابہ کرامؓ کے مقدس طبقے کے ذریعے مشرف باسلام ہوا اور اپنی پرانی تہذیب و ثقافت کو ایسا خیر باد کہا کہ اپنی سابقہ زبان کی جگہ مستقل طور پر عربی زبان کو اپنا لیا۔ یہ عالم اسلام کا ایک عظیم علمی مرکز رہا بلکہ بہت سے تاریخی ادوار میں ایک قسم کا علمی دار الخلافہ رہا ہے' عراق کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دار الخلافہ ہونے کا شرف حاصل ہوا' اسی طرح عباسی دور خلافت میں مسلمانوں کا سیاسی مرکز رہا۔ کوفہ'

بصرہ اور بغداد نے جو علمی شخصیات پیدا کیں وہ شاید ہی کسی اور خطے کے حصے میں آئی ہوں۔ اسی طرح شام کو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جیسے سنہری ادوار میں مسلمانوں کی مرکزیت کا شرف حاصل ہوا' غرض کہ ان علاقوں میں اسلام کی جڑیں بڑی گہری اور مضبوط تھیں' ان علاقوں کی اپنی پرانی تہذیب بھی زندہ نہیں تھی بلکہ مصر' شام اور عراق میں تو ان پرانی تہذیبوں کا خاتمہ صحابہ کرامؓ کے مقدس ہاتھوں سے ہو چکا تھا' اس سب کچھ کے باوجود یہاں قوم پرستی نے جو کچھ کر دکھایا وہ اس کے خطرناک زہر کو سمجھنے اور عبرت حاصل کرنے کے لئے کافی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا معاملہ ان علاقوں سے کافی مختلف تھا۔ یہاں مسلمان اکثریت میں نہیں تھے بلکہ اقلیت میں تھے' بے شک اس سرزمین نے بھی اولیاء' علماء اور قائدین کی شکل میں اسلام کے عظیم سپوت پیدا کئے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہاں اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کی جڑیں اتنی مضبوط نہیں تھیں جتنی کہ مذکورہ بالا علاقوں میں' وہاں قوم پرست لوگوں کو قدیم جاہلی تہذیب کے احیاء کے لئے محنت کرنا پڑی جب کہ یہاں کی پرانی ہندی تہذیب زندہ اور اکثریت کی شکل میں موجود تھی۔ پھر اسلام اور عربیت کے گہرے تعلق کی وجہ سے القومیہ العربیہ یا العروبہ کی دعوت دیتے ہوئے اسلام کو اجنبی اور بدیسی قرار دینا بھی انتہائی مشکل تھا جب کہ اسلام یقیناً سرزمین ہند اور ہندی قومیت کی پیداوار نہیں ہے' ترکی شام اور عراق میں قوم پرست حکومتوں کے اثرات و نتائج اور ان علاقوں اور ہندوستان میں مذکورہ بالا فروق کو مدنظر رکھا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا کہ یہاں وطنی قومیت کا ایک جھٹکا بھی کتنا خطرناک ہو سکتا تھا۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ کانگریس کا راستہ اسی قومیت کی طرف اور اس کے ساتھ ساتھ سیکولرازم کی طرف جاتا تھا' اس کے علاوہ کانگریس کے بہت سے مؤثر

رہنما کمیونسٹ نظریات بھی رکھتے تھے' اس طرح کانگریس اور حزب البعث وغیرہ میں کوئی فرق تلاش کرنا بڑا مشکل ہے سوائے اس کے کہ ایک ہندی قومیت کی داعی تھی دوسری عرب قومیت کی۔ متحدہ قومیت کا مقصد عام طور پر مختلف مذاہب و طبقات سے تعلق رکھنے والوں کا محبت و آشتی اور مذہبی رواداری کے ساتھ ایک وطن میں رہنا اور اس کی تعمیر و ترقی کی مشترکہ کوشش کرنا سمجھا جاتا تھا اور یہی سوچ کر بہت سے مخلص مسلمان اس کی حمایت کر رہے تھے' لیکن تجربے نے یہی ثابت کیا کہ یہ وطنی قومیت کا نعرہ اسلام کے لئے تو بہر حال زہر قاتل ہی ثابت ہوا' وطنی قومیت سیکولرازم اور اشتراکیت کے اس آمیزے نے مسلم اکثریتی ممالک میں اسلام کا نام لینا مشکل کر دیا تھا۔ خود ہندوستان میں اکبر کے "دین الٰہی" کی شکل میں اس طرح کی متحدہ قومیت اور سیکولرازم کا تجربہ ہو چکا تھا۔ بقول اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار کے "دین الٰہی کی تشکیل میں جو محرکات کار فرما تھے ان میں ملکی مصالح کو سب سے زیادہ اہمیت دی جا سکتی ہے۔" (ج ۲/ص ۵۶۵) لیکن "ملکی مصالح" پر مبنی اس دین اور مذہبی رواداری سے اسلام کو کیا ملا اس کا اندازہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے اس اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

> "صلح کل کی آڑ میں ہندوؤں کو اجازت مل گئی کہ وہ رمضان میں علی الاعلان کھائیں پئیں لیکن جب ہندو برت رکھیں تو مسلمان علانیہ کھانے پینے سے باز رہیں' بعض مقامات پر عیدالاضحیٰ کے موقع پر گائے ذبح کرنے کی پاداش میں مسلمانوں کی جان لی گئی' بعض مقامات پر ہندوؤں نے مساجد کو منہدم کر کے مندر بنا لئے وغیرہ وغیرہ۔"

(ج ۹/ص ۵۶۸)

حقیقت یہ ہے کہ گاندھی کا فلسفہ اور اس کی داعی کانگریس اس اکبری دین

ہی کا دوسرا جنم اور دوسرا روپ تھا جس میں دور جدید کے نئے تقاضوں اور نئے نعروں کو شامل کر لیا گیا تھا۔[ے]

منشی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم رقمطراز ہیں:

"اس (کانگریس کا) دوسرا مقصد ملک میں ہندو دھرم کا احیاء تھا جس کی وضاحت خود "تاریخ کانگریس" میں گاندھی جی کے منظور نظر کانگریس کی مجلس عاملہ کے رکن اور آل انڈیا اسٹیٹس پیپل کانفرنس کے صدر ڈاکٹر پٹابھی ستیارامیہ نے یوں کر دی کہ:

" یہ تمام (برہمو سماج اور آریہ سماج وغیرہ) تحریکیں حقیقتاً ہندوستانی قومیت کی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھیں اور اب قوم کا فریضہ تھا کہ ایک جامع چیز پیدا کی جائے جس کے ذریعے تعصبات اور اوہام کو رفع کیا جائے اور قدیم دین یعنی "ویدانتی تصورات" کا احیاء کر کے اور نکھار کر اسے عہد جدید کی قومیت سے مطابقت دے کر چلایا جا سکے' انڈین نیشنل کانگریس کے ذریعے اس مشن کا پورا ہونا مقدر تھا۔" (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص ۲۲)

ے ضمناً و استطراداً یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ خواب میں کسی صاحب کو حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے ایک چمکتی ہوئی تلوار یہ کہہ کر عطاء فرمائی تھی کہ "بعد سلام مسنون میرا یہ تحفہ شبیر احمد عثمانی کو دے دینا۔" حضرت عثمانی رحمہ اللہ نے اس خواب کے متعلق فرمایا کہ بھائی مسلم لیگ کی فتح یقینی ہے' یہی وہ مجددی تلوار ہے جس سے اکبری قومیت متحدہ اور دین الٰہی کو فنا کے گھاٹ اتار اگیا تھا' اب انشاء اللہ العزیز ہم اسی مجددی حربہ سے کانگریس کی قومیت متحدہ اور گاندھی ازم کو ہمیشہ کیلئے موت کی نیند سلا دیں گے۔ (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص ۱۲۴)

"عہد جدید کی قومیت" سے مطابقت رکھنے والی اور "تعصبات" سے پاک اس "جامع چیز" (جس میں اسلام کے لئے بھی کچھ نہ کچھ گنجائش رکھی گئی ہوگی) میں اور اکبری دین میں فرق صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک مسلمان بادشاہ نے ہندومت اور دوسرے مذاہب کی طرف میلان کر کے "ایک جامع چیز" کی دعوت دی تھی اس لئے مسلمانوں کا اس سے کبیدہ خاطر ہونا ایک فطری امر تھا اور یہاں یہ کام ایک ہندو لیڈر کے ہاتھوں انجام پا رہا تھا اور یہ کام اس کی بے تعصبی' فراخ دلی اور اسلام کے بارے میں ہمدردانہ و خیر خواہانہ رویہ کا مظہر سمجھا جا رہا تھا۔ گویا مسلمان کے دوسرے مذہب کی طرف جھکاؤ کی جائے غیر مسلم کے اسلام کے ساتھ حسن سلوک کا تاثر تھا جس سے مسلمانوں کے دلوں میں اس کے متعلق نرم گوشہ پیدا ہونا ایک واضح امر تھا۔ پھر اکبری متحدہ قومیت کا داعی ایک بادشاہ تھا یہاں ایک مظلوم قوم کا لیڈر اور قافلہ حریت کا "میر کارواں" تھا جو مظلومیت' انسان دوستی' رحم دلی اور وطن پرستی کی اداکاری میں خوب مہارت رکھتا تھا۔[ے] اس مکار لیڈر کو ہندوستان کی تمام اقوام و مذہب کا ایک مشترکہ غیر متنازعہ قائد اور ایک قسم کا "بابائے قوم" بنایا جا رہا تھا۔ "عہد جدید کی قومیت" کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ متحدہ قومیت کے لئے ایک متحدہ لیڈر بھی ایجاد کیا جائے جسے متحدہ قوم کے تمام طبقات کی مشترکہ متاع سمجھا جائے' اس مقام کا سب سے بڑا امیدوار بلکہ شاید واحد امیدوار گاندھی تھا۔

ے یہاں یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ایک دفعہ وائسرے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے گاندھی کی قریبی ساتھی اور کانگریس کی ایک لیڈر سروجنی سے پوچھا کہ آیا کانگریس گاندھی جی کی حفاظت کر سکتی ہے جب کہ وہ غریبی کا رویہ اختیار کئے زندگی گزارنے پر تلا ہوا ہے؟ تو اس پر سروجنی نائیڈو نے جو جواب دیا اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ میرے محترم لارڈ ماؤنٹ بیٹن حضور! آپ یہ کبھی نہیں جان سکیں گے کہ اس بزرگ کو غریب رکھنے کے لئے کیا کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ (تحریک پاکستان تاریخی خدوخال ص ۱۰۲)

بہت سے مسلم رہنما اس کی قیادت پر ایمان کو کامیابی کی بنیادی شرط قرار دے رہے تھے۔ اس طرح سے اکبری دین کا یہ نیا روپ پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔

گاندھی جی اور ان کی کانگریس کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے تھے' اس کا اندازہ محدث العصر حضرت علامہ بنوریؒ کے ایک دیرینہ رفیق حضرت مولانا لطف اللہ پشاوری کے ایک مضمون کے اس اقتباس سے ہو سکتا ہے:

"یہ زمانہ صوبہ سرحد میں سیاسی کشمکش کا تھا باوجودیکہ صوبہ سرحد کی عام آبادی ٹھیٹھ مذہبی ہے اور وہ جو کچھ کرتی تھی اسلام کے نام پر کرتی تھی مگر گاندھی جی نے لیڈران کرام کو سیکولرازم کا سبق پڑھا دیا تھا۔ شاید ان لیڈروں کو بھی معلوم نہ تھا کہ ہمیں کیا پڑھایا جا رہا ہے لیکن کانگریسی ہندو اور پارسی عورتوں کی آمدورفت نے نوجوانوں میں بے دینی پھیلا رہی تھی۔"

(ماہنامہ بینات حضرت بنوریؒ نمبر ص ۲۸)

صوبہ سرحد میں گاندھی کے نظریات کی ترجمانی غفار خان اور ان کی سرخ پوش جماعت کر رہی تھی' اسی حوالے سے غفار خان سرحدی گاندھی بھی کہلاتے تھے۔ چونکہ یہ جماعت بھی انگریز سے آزادی کی داعی تھی اس لئے سرکاری ٹوڈی طبقے کی خواہش تھی کہ سرخ پوشوں کو علماء سے لڑایا جائے' اس صورت حال کے متعلق مولانا لطف اللہ پشاوری فرماتے ہیں:

"ہمارے لئے مشکل یہ تھی کہ اگر سرخ پوشوں کی مخالفت کرتے ہیں تو اس ٹوڈی طبقے کی خواہش بر آتی ہے اور اگر خاموش رہتے ہیں تو گاندھی جی کا سیکولرازم چپکے چپکے

اپنا کام کر رہا ہے۔ نوشہرہ' مردان اور چارسدہ وغیرہ سے آ کر بہت سے لوگ شکایت کرتے تھے کہ سرخ پوش علماء کی توہین کرتے ہیں۔" (حوالہ سابقہ)

اس سے جہاں ان حضرات علماء کا جدوجہد آزادی سے مخلصانہ تعلق واضح ہوا کہ ان سرخ پوشوں کی مخالفت میں بھی یہ امر پیش نظر رکھا کہ اس سے سرکاری طبقے کو تقویت یا خوشی نہ ہو وہیں سرخ پوشوں کی ذہنیت بھی واضح ہو گئی کہ ان لوگوں کو اتنی بھی توفیق نہ ہوئی کہ کم از کم اس سرکاری طبقے کی خواہش کو خاک میں ملا دینے کیلئے ہی علماء کی توہین اور لادینی نظریات ترک کر دیں بلکہ اس کے برعکس باوجودیکہ حضرات علماء جذبہ آزادی میں سرخ پوشوں سے کم نہیں تھے اور حضرت بنوریؒ کی قائم کردہ جمعیۃ علماء سرحد سے بقول حضرت مولانا لطف اللہ صاحب ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا بلکہ کچھ فائدہ ہی پہنچا۔ اس کے باوجود "آزادی کے ان متوالوں" نے جمعیۃ العلماء کو خوشدلی سے برداشت نہیں کیا بلکہ بقول حضرت مولانا لطف اللہ:

"لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود سرحد کے سرخ پوش یہ سمجھتے تھے کہ صوبہ سرحد میں ان کے سوا کوئی اور جماعت نہیں ہونی چاہئے اس لئے جمعیۃ علماء صوبہ سرحد سے ان کی کشمکش جاری رہتی تھی اور حکومت بھی اس کشمکش سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی' چنانچہ مولانا بنوریؒ نے سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی۔" (حوالہ سابقہ ص ۲۹)

لیکن سرخ پوشوں کے اس رویہ میں زیادہ تعجب کی بھی کوئی بات نہیں اس لئے کہ ان کا مقصد محض حصولِ آزادی نہیں تھا بلکہ خاص قسم کی لادینی آزادی مطلوب تھی۔ اس لئے حضرت بنوری قدس سرہٗ جیسی قابل رشک دینی غیرت و حمیت رکھنے والی شخصیات کے ساتھ باوجود پوری احتیاط کے ان کی کشمکش ہو جانا کوئی

بعید از قیاس نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ پہلے تو متحدہ قومیت کی راگنی الاپتے رہے اور وسیع و عریض ہندوستان ان کو ایک ہی قوم نظر آتا رہا لیکن مسلم قومیت کی بنیاد پر ایک ملک کے قیام کا فیصلہ ہو گیا تو فوراً ان کو چھوٹے سے پاکستان میں چار قومیں نظر آنے لگ گئیں۔

کانگریسی سوچ کے منفی اثرات صرف عوام اور لیڈروں پر ہی مرتب نہیں ہو رہے تھے بلکہ جمعیۃ علماء ہند جیسی جماعت بھی ان سے بالکل محفوظ نہیں تھی۔ چنانچہ مولانا ابو الکلام آزادؒ کے وہ افکار جن میں وحدت ادیان کی طرف جھکاؤ پایا جاتا ہے اور جن کا حاصل حضرت علامہ بنوری قدس سرہٗ کے مطابق یہ ہے کہ اسلام ایک عام دینی وحدت کا نام ہے جو کہ کسی خاص مذہب کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ سارے ادیان اسی عام وحدت اور کامل سچائی کی طرف بلاتے ہیں۔ باقی جہاں تک شرائع اسلامیہ اور عبادات کا تعلق ہے تو یہ محض ظاہری رسوم ہیں ان کے انکار سے کوئی شخص اسلام سے نہیں نکلتا (اصل اہمیت اسی بنیادی وحدت اور عمومی سچائی کی ہے جس کی دعوت ہر ملت میں پائی جاتی ہے)۔ یہاں اس نظریہ کی تردید کا موقع نہیں۔ ؎ کہنا یہ مقصود ہے کہ ان نظریات میں موصوف کے "آزاد" ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت کی عام کانگریسی سیاسی ذہنیت کے دخل کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"علماء ہند کا شاندار ماضی" کے مؤلف جمعیۃ علماء ہند کی نمایاں شخصیات میں سے ہیں اور غالباً اس کے ناظم بھی رہے ہیں اور بہت سی قابل قدر علمی و تالیفی

؎ حضرت اقدس علامہ بنوری قدس سرہٗ نے اپنی کتاب یتیمۃ البیان میں مولانا آزادؒ کے علمی و ادبی کمالات اور ملی و سیاسی خدمات کے بھرپور اعتراف کے ساتھ ساتھ ان کے اس قسم کے شاذ نظریات کی پرزور تردید فرمادی ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ و رسول کی رضا ایسے شخص کی رضا سے اہم ہے جسے کوئی پرواہ نہیں، کیا اس کا قلم اور زبان، سے کون سی وادی میں ہلاک کر رہے ہیں۔

خدمات کے لئے معروف ہیں، انہوں نے اپنی مذکورہ بالا کتاب کی دوسری جلد میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ سے لے کر حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ تک کے کارناموں کا ذکر کیا ہے اور شروع شروع میں یہ فرمایا ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ انقلابی طریقے سے کام کرنا چاہتے تھے لیکن :

> "ایسا انقلاب پیشہ ور سپاہیوں کے ذریعے نہیں ہو سکتا بلکہ ان رضاکاروں کے ذریعے ہو سکتا ہے جن کی تربیت خاص طور پر کی گئی ہو، جو نصب العین کو سمجھیں اور اصلاحی نظریات پر پہلے اپنے آپ کو ہموار کریں اس کے بعد ان کو کامیاب بنانے کے لئے قربان ہو جانا اپنی زندگی کا آخری مقصد بنالیں۔"
>
> (علماء ہند کا شاندار ماضی ج ۲/ ص ٦)

چنانچہ مؤلف کے بقول حضرت شاہ صاحبؒ نے سب سے پہلے یہی خدمت انجام دی اور اصلاحی نظریات مرتب فرمائے، اس کے بعد مؤلف مرحوم نے اقتصاد، سیاست، بنیادی حقوق، بین الاقوامی تحفظات، مذہبیات اور جہاد کے متعلق شاہ صاحبؒ کے یہ "اصلاحی نظریات" ذکر کئے ہیں۔ مذہبیات کے عنوان کے تحت جو کچھ لکھا ہے اسے بطور نمونہ نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے :

> (الف)۔۔۔۔ دین اور سچائی کی بنیاد ایک ہے، اس کے پیش کرنے والے ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔
>
> (ب)۔۔۔۔ داعیان صداقت ہر ملک اور قوم میں گزرے ہیں، ان سب کا احترام ضروری ہے۔
>
> (ج)۔۔۔۔ سچائی اور دین کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں، مثلاً اپنے پروردگار کی عبادت، اس

کے لئے نذر و نیاز صدقہ وخیرات وغیرہ یہ سب، کام سب
کے نزدیک اچھے ہیں البتہ عملی صورتوں میں اختلاف ہے۔
(د)۔۔۔۔۔ ساری مہذب دنیا کے سماجی اصول اور ان کا منشاو
مقصد ایک ہے، مثلاً ہر ایک مذہب اور فرقہ جنسی انار کی کو نا
پسند اور اخلاقی جرم قرار دیتا ہے۔ جنسی تعلقات کے لئے مرد
اور عورت میں ایک معاہدہ ہر ایک فرقہ میں ضروری ہے
البتہ معاہدہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایسے ہی ہر ایک فرقہ
اپنے مردہ کو نظروں سے غائب کر دینا ضروری سمجھتا ہے
اختلاف اس میں ہے کہ زمین میں دفن کر کے نظروں سے
اوجھل کیا جائے یا جلا کر۔" (حوالہ سابقہ ج ۲ / ص ۱۰)

کیا واقعی ولی اللّٰہی جماعت کی انقلابی جدو جہد صرف انہی مقاصد کیلئے تھی؟
کیا یہی اس جماعت کا نصب العین تھا؟ کیا یہی وہ اصلاحی نظریات ہیں جن کی تکمیل
پیشہ ور سپاہیوں کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی تھی بلکہ ان کے لئے شاہ ولی اللہ رحمہ
اللہ اور ان کے خلفِ اکبر شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ایسی تربیت خاص کا اہتمام فرمایا
کہ ان تربیت یافتگان نے ان اصلاحی نظریات کے لئے قربان ہو جانے کو اپنی زندگی کا
آخری نصب العین بنالیا تھا؟ کیا انہی مذہبیات کے لئے حضرت سید احمد شہید رحمہ
اللہ اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ اور ان کے رفقاء نے علَمِ جہاد بلند فرمایا تھا
اور تمام فرقوں کے مسلمہ سچائی اور دین کے انہی اصولوں اور ساری مہذب دنیا کے
متحد المقصد سماجی اصول کے لئے ہی اپنی قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا؟
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مذکورہ بالا مذہبیات اور اصلاحی نظریات پر تبصرہ کرنے کی تو ضرورت اور
موقع نہیں لیکن اتنا عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف مرحوم نے

حجة الله البالغه کے جس مقام کا حوالہ دیا ہے اور جہاں سے اس نصب العین
کو کشید کرنے کی کوشش کی ہے اس سے تقریباً دو ہی صفحے قبل حضرت شاہ صاحبؒ
نے فرمایا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی دور کے نبی کی تعلیمات سے ہٹ کر کسی کے
پاس زندگی کا کوئی اچھا طریقہ (سنت راشدہ) موجود ہو، لیکن بفرضِ محال ایسا ہو بھی
جائے تب بھی اس دور کے نبی کی اتباع ہی لوگوں پر واجب ہو گی۔ اس کے بغیر بہتر
سے بہتر نظام بھی بالفرض وہ اپنالیں تب بھی ملأ اعلیٰ کی طرف سے وہ لوگ ملعون
ہوں گے۔[۵] اس بات کا یقیناً مؤلف مرحوم بھی اعتقاد رکھتے ہوں گے، لیکن اس کی
وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ شاہ صاحبؒ کی عبارت سے زبردستی کشید کردہ مذکورہ بالا
مذہبیات تو ولی اللّٰہی جماعت کا نصب العین قرار پائیں اور شاہ صاحبؒ ہی کی جن
عبارات سے نبی آخر الزمان ﷺ کی شریعت مطہرہ (یا مہذب دنیا کے سماجی اصولوں
کی اسلامی رسوم واشکال) میں رشد و درستگی کا منحصر ہونا اور باقی شرائع کا باعث لعنت
ہونا سمجھ میں آرہا ہے ان سے ایسا صرف نظر کیا گیا کہ انہیں فکر ولی اللّٰہی کی مستقل
دفعہ یا شق بنانا تو دور کی بات ہے مہذب دنیا کے سماجی اصول اور ان کے منشاو مقصد کا
اتحاد بناتے ہوئے ضمناً بھی یہ قید لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ولی اللّٰہی
جماعت کے نزدیک ان متحد المقاصد اصولوں کی صرف وہی شکل درست اور واجب
العمل ہے جو اسلام نے متعین کر دی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریک ایک خالص دینی اور
مذہبی تحریک تھی جس کے دو بڑے مقاصد بدعات ورسوم کا خاتمہ اور ٹھیٹھ اسلامی
معنی میں فریضۂ جہاد کا احیاء تھے، بالخصوص ہندوستان کی دو طاقتور کافر حکومتوں انگریز
اور سکھ کے خلاف آپؒ نے سکھ حکومت سے جہاد کی ابتداء اس لئے کی کہ وہ اسلامی

---

[۵] ملاحظہ ہو ص ۸۵ / ج ا باب حقيقة النبوة وخواصه مطبوعہ مکتبہ سلفیہ لاہور)

شعائر کو انگریزوں سے زیادہ نقصان پہنچا رہی تھی لیکن "علماء ہند کا شاندار ماضی" بیان کرتے ہوئے مؤلف مرحوم نے حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ اور ان کے رفقاء کی ذاتی زندگیوں میں تو تدین و تقویٰ کو نمایاں کیا ہے لیکن جہاں تک مقاصد تحریک کا تعلق ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کہ اس سے دینی و مذہبی آثار کو کھرچ کھرچ کر صاف کرنے اور اسے ایک سیاسی و علاقائی نوعیت کی انقلابی تحریک قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ؔ اس تحریک میں جو مذہبی رنگ واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا اس کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"گو اصل مقصود اقتصادی مسائل کی بنیاد پر
ایشین اتحاد اور سیاسی انقلاب ہی تھا لیکن اس بنیاد پر روح
انقلاب پیدا نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے سیاسی انقلاب اور
ایشین اتحاد کے لئے مذہبی عنوان کا راستہ مختصر بھی تھا اور اس
سے کامیابی کی توقع بھی زیادہ تھی۔"

(علماء ہند کا شاندار ماضی ج ۲/ص ۱۳۲)

یہی انقلاب' اس کے لئے کوئی شخص بال بچوں کو
بھوکا پیاسا چھوڑ کر نکل کھڑا ہو تو اس کا ہر اقدام مبارک اور
اس کی ہر ایک قربانی باعث اجر عظیم ہے اب وہ گرد مقدس

ؔ مؤلف مرحوم نے صحیح تاریخ کے آرزو مندوں کی خدمت میں یہ کتاب پیش کرنے کا مقصد یہ بیان فرمایا ہے کہ برطانوی سامراج کی پیدا کردہ تلخیاں ختم ہوں اور ہندوستان سے پھر سے پریم و محبت کا باغ ارم بنے' شاید اسی مقصد کی خاطر اپنے ان سارے اسلاف کے مذہبی کٹرپن سے برأت ثابت کی جا رہی ہے لیکن اس میں کس قدر کامیابی ہوئی اس کا اندازہ بھارت کے مسلم کش فسادات اور بابری مسجد جیسے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے اصل میں یہ تلخیاں برطانوی سامراج سے زیادہ ہندو ذہنیت کی پیدا کردہ ہیں۔

ہے جو اس کے پیروں پر پڑتی ہے اور وہ غبار بھی طوطیاء چشم
سعادت ہے جس سے اس کے کپڑے میلے ہوتے ہیں۔

(حوالہ سابقہ)

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور کی رائج الوقت سیاسی ذہنیت اور متحدہ قومیت و استخلاص وطن کے نعرے اپنے اندر جو نظریاتی و فکری مفاسد لئے ہوئے تھے ان کے اثرات سے طبقہ علماء کی شخصیات بھی پورے طور پر محفوظ نہیں رہ سکی تھیں' مذکورہ بالا انداز گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کانگریسی سوچ عام مسلمان اور غیر عالم لیڈروں کے ذہنوں پر کس قسم کے اثرات مرتب کر رہی تھی اور کر سکتی تھی۔

یہ تو صرف چند مثالیں ہیں' ان کے عرض کرنے کا مقصد بھی کسی جماعت یا شخصیت کو مطعون کرنا نہیں بلکہ صرف یہ بتلانا ہے کہ کانگریس کی دعوت پر چلنے والی مختلف تحریکات اور کانگریسی انداز سیاست بالخصوص علماء کی اس میں شرکت پر گفتگو کرتے ہوئے حضرت حکیم الامتؒ کے لہجہ میں شدت اور تغیر کے آثار نمایاں ہوں تو ان پر حیرت نہیں ہونی چاہئے' اس جیسی بہت سی باتوں اور واقعات کی وجہ سے حضرتؒ کانگریس کو مسلمانوں کے لئے دینی و ایمانی لحاظ سے بھی انتہائی مضر سمجھتے تھے' مثلاً گاندھی کے بارے میں ایک مرتبہ فرمایا:

"فلاں سیاسی کافر کم بخت دجال سے کم نہیں' نہ
معلوم کتنے لوگوں کے ایمان خراب کئے اور دجال کیا کرے گا
وہ بھی یہی کرے گا۔"

(مولانا تھانوی اور تحریک آزادی ص ۳۵)

حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریک کی یہ تشریح کہ اس کا مقصد اقتصادی مسائل کی بنیاد پر ایشین اتحاد اور سیاسی انقلاب تھا' مذہب کو محض عنوان

کے طور پر اختیار کیا گیا تھا' اس تشریح کو ذہن میں رکھ کر حضرت حکیم الامتؒ کا مندرجہ ذیل ملفوظ پڑھیے اور اندازہ فرمایئے کہ حضرتؒ اس وقت کی سیاسی تحریکات کے مزاج کو کس گہرائی کے ساتھ سمجھے ہوئے تھے:

> ہم لوگ کانگریسیوں کی امداد نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے خیال میں کانگریسی اصل میں بالشویک ہیں؎ یہ کسی طرح بھی مذہب کی حامی جماعت نہیں بلکہ محض سیاسی جماعت ہے جس میں زیادہ حصہ مذہب کے خلاف ہے۔"
>
> (الافاضات الیومیہ ج ۴ / ص ۱۴۵ ملفوظ نمبر ۱۴۲)

اسی طرح ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا:

> "تحریکات حاضرہ میں کس قدر جلد دینی انقلاب ہو گیا۔۔۔۔اور عوام تو بچارے کس شمار میں ہیں علماء تک اس گڑبڑ میں پھنس گئے ہیں اور حدود سے نکل کر بے قید میدان میں آ کھڑے ہوئے اور زیادہ گمراہی ان ہی لوگوں کی وجہ سے پھیلی اس لئے کہ یہ لوگ مقتدا اور پیشوا کہلاتے ہیں تو ان کا اثر ہونا ہی چاہیے تھا۔"
>
> (الافاضات الیومیہ ج ۴ ملفوظ نمبر ۱۴۴)

اسی طرح گاندھی کی اندھی تقلید میں قرآن وحدیث کو تختۂ ستم بنانے کی بھی آپ نے ملفوظات میں جگہ جگہ شکایت کی ہے' مثلاً ایک موقع پر آپ نے فرمایا:

؎ بالشویک وہ سوشلسٹ جماعت جو روس کے سابقہ نظام کا فوری خاتمہ کر کے پرولتاریہ (محنت کش طبقہ) کی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے کی داعی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ ۱۹۱۷ء میں لینن کی زیر قیادت روس میں اشتراکی انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے۔

> "جو بات گاندھی کے منہ سے نکل جائے فوراً اس کو قرآن وحدیث پر منطبق کرتے ہیں اس تحریک میں کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جو کسی مسلمان یا عالم کی تجویز ہو۔۔۔۔۔ سخت صدمہ اور سخت افسوس ہے اس کی باتوں کو قرآن وحدیث سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"
>
> (مولانا تھانوی اور تحریک آزادی ص ۳۶)

ایک اور موقع پر فرمایا:

> "جو گاندھی کے منہ سے نکل جائے اس کو قرآن وحدیث میں ٹھونسنا ان کا کام ہے' دیکھئے اتنا زمانہ گزر گیا ہے کہ گاندھی نے کوئی نئی چیز کا اعلان نہیں کیا سب خاموش ہیں اب وہ کسی نئی سکیم کی فکر میں ہو گا وہی سکیم مسلمانوں کو قرآن وحدیث میں نظر آنے لگے گی۔"
>
> (حوالہ سابقہ ص ۳۶)

گویا قرآن وحدیث کے ساتھ جو معاملہ سر سید وغیرہ نے مغربی افکار سے متاثر ہو کر اور اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کے شوق میں کیا وہی سلوک ان لوگوں نے گاندھی کی تقلید میں اور آزادیٔ وطن کے شوق میں روا رکھا۔

عام طور پر مسلم لیگ پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ اس میں اکثریت ایسے مغرب زدہ طبقے کی ہے جس کے قلوب میں دین اور اہل دین کا کوئی احترام نہیں۔ یہ بات ایک حد تک درست بھی تھی لیکن کانگریس اور اس کے حامیوں میں بھی ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہ تھی' سرحد کے سرخ پوشوں کا دین اور علمائے دین کے ساتھ رویہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں' اب بھی اے این پی کی ذہنیت اس دور کی زندہ یادگار ہے۔ ہندو پرستی اور گاندھی کی قیادت پر ایمان کامل کے علاوہ عام کانگریسی لیڈر

مغربیت میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے' مغربی اطوار اپنانے اور خود مغربی استعمار سے آزادی کے لئے مغربی طریقے اختیار کرنے پر بھی حضرتؒ کے ملفوظات میں ان پر تنقید کی گئی۔ ایک جگہ آپ نے فرمایا:

"نصرانیت اور انگریزیت کی برائی کرتے ہیں اور دل میں وہی باتیں رچی ہیں انہی جیسا لباس' انہی جیسی معاشرت اختیار کر رکھی ہے مجھے تو ایک عالم کا قول پسند آیا کہ یہ لوگ نصرانیوں کے مخالف ہیں اور نصرانیت کے حامی ہیں' بات تو کام کی کہی واقعی یہی ہو رہا ہے۔"

(الافاضات الیومیہ ج ۵ / ص ۱۳۶' ملفوظ نمبر ۱۵۲)

بعض حضرات کے انداز گفتگو سے تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ سمجھ رہے ہوں کہ کانگریس کی حمایت یا اس میں شرکت کرنے والے مسلمان سارے کے سارے حضرت مدنی رحمہ اللہ' حضرت مفتی کفایت اللہ رحمہ اللہ جیسے اکابر کی طرح کے مقدس اور متدین تھے۔

اصل بات یہ عرض کی جارہی تھی کہ کانگریس سیکولرازم' وطنیت اور متحدہ قومیت وغیرہ نظریات کی بنیاد پر آزادی کی جنگ لڑرہی تھی' وہ مسلمانوں کے عقائد و نظریات اور ان کی دینی سوچ کے لئے زہر قاتل تھے' کانگریسی سوچ کی وجہ سے مسلمانوں کی فکر پر بہت برے اثرات مرتب ہو رہے تھے حتیٰ کہ دین دار اور اہل علم کا طبقہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا جو مخلص و متدین علماء کرام کانگریس کی حمایت کر رہے تھے ان کے پیش نظر اس کی انگریزی استعمار کے خلاف جدوجہد تھی اور یقیناً کانگریس کا یہ ایک مفید پہلو تھا۔ باقی جہاں تک اس کے نقصانات اور جانبی اثرات (Side Effects) کے ازالے کا تعلق ہے تو اسے وہ بعد

کا مسئلہ سمجھتے تھے جب کہ دوسری طرف کے اکابر کی نظر میں انہی برائیوں بلکہ خطرناک دینی زہر کی وجہ سے کانگریس اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا کا مصداق بن چکی تھی۔ ان کی نظر میں ان خرابیوں کا ازالہ اور ان گمراہیوں کا سدباب فوری ضروری تھا' اس کا طریقہ ان کے خیال کے مطابق یہی تھا کہ مسلمان کانگریس میں شمولیت اختیار کرنے کی بجائے اپنی الگ تنظیم قائم کر کے آزادی کی جدوجہد کریں اور یہ ثابت کریں کہ گاندھی اور اس کے فلسفے کے بغیر بھی آزادی کا حصول ممکن ہے۔

دراصل برصغیر میں مسلمانوں کے تشخص اور بقاء کا مسئلہ محض انگریز کا پیدا کردہ عارضی مسئلہ نہیں تھا بلکہ اس کی جڑیں ماضی میں بہت گہری تھیں۔ چند صدیاں قبل اکبری دور میں علماء حق اسی مسئلے پر اپنی توانائیاں صرف کر چکے تھے۔ اس مسئلے کی اہمیت کا اندازہ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی اس بات سے لگایا جا سکتا ہے جسے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے ملفوظات و مواعظ میں کئی جگہ نقل فرمایا ہے کہ:

"ذبح بقرہ در ہندوستان از اعظم شعار اسلام است" (ہندوستان میں گائے ذبح کرنا بڑے اسلامی شعاروں میں سے ہے۔) (محاسن اسلام ص ۲۷۱ مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

کانگریس کے برعکس مسلم لیگ کے ارباب بست و کشاد خود ذاتی حیثیت میں کیسے ہی ہوں ان کے عقائد و نظریات جو بھی ہوں عوام کو بنیادی نعرہ اور نظریہ اس نے دو قومی نظریہ اور مسلم قومیت ہی کا دیا تھا' یہ نظریہ بذات خود کسی بھی موقع پر کسی نظریاتی قباحت کا پیش خیمہ نہیں بن سکتا تھا' اگر خرابیاں پیدا ہوئی ہیں تو اس نظریہ کو نظر انداز کرنے یا کم اہمیت دینے کی وجہ سے ہوئی ہیں۔

(۴) دو قومی نظریہ قرآن و سنت کے مطابق ہے

صرف اتنا ہی نہیں کہ دو قومی نظریہ مسلمانوں کے لئے دینی لحاظ سے غیر مضر تھا بلکہ اسلامی قومیت کا یہ نظریہ قرآن و حدیث کے مطابق بھی ہے۔ متحدہ قومیت کا حاصل یہی ہے کہ ہندو، مسلم، سکھ، پارسی وغیرہ ایک علاقہ یعنی ہندوستان کے باشندے ہونے کے ناطے ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ قومیت کی بنیاد وطن یعنی ہندوستانی ہونا ہے، مذہب کا معاملہ کسی کے لئے کتنا ہی اہم اور مقدس کیوں نہ ہو قومیت کی تشکیل کی بنیاد نہیں بن سکتا جب کہ دو قومی نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ گو دنیا کے دستور کے مطابق قوم کی بنیاد علاقہ، وطن اور زبان وغیرہ کے رشتے ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے قومیت کی سب سے بڑی بنیاد دین ہی ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھ لینا ضروری ہے کہ یہاں لفظ قوم سے مراد اس کے لغوی معنی نہیں، لغوی معنی کے لحاظ سے ایک کافر کسی مسلمان کا ہم قوم بن سکتا ہے، اس بحث میں لفظ قوم ایک سیاسی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو کہ انگریزی لفظ Nation اور عربی لفظ أمة کا مترادف ہے، قومیت کی سیاسی معنی کے اعتبار سے مختلف تعریفیں کی گئی ہیں لیکن قدر مشترک سب کا یہ ہے کہ قومیت کسی گروہ کا ایک ایسا جذبہ ہے جس کی وجہ سے وہ خود کو ایک اور دوسروں سے الگ سمجھتے ہیں، اسی جذبۂ وحدت و غیریت کی بنیاد پر وہ آزاد اور خود مختار ریاست کی تشکیل کے لئے جدوجہد شروع کر دیتے ہیں یا ایسی ریاست قائم کر لیتے ہیں تو ایک قوم بن جاتے ہیں۔

قومیت کے اسی معنی (یعنی اپنائیت کے جذبہ) کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی سب سے بڑی بنیاد مذہب ہی ہے۔ مذہب ہی ایک ایسا رشتہ ہے جو مسلمانوں

کے لئے سب سے اہم رشتہ ہے جس کی وجہ سے وہ کسی کو اپنا سمجھتا ہے۔ دوسرے رشتوں کا اسلام انکار نہیں کرتا لیکن اپنائیت کے معاملہ میں اصل اہمیت اسلام ہی کو حاصل ہے اس لئے مسلمانوں کے نزدیک قومیت کی بنیاد وطن، نسل اور زبان وغیرہ کی بجائے دین ہی ہونا چاہئے، اسی کا نام "مسلم قومیت" ہے۔

حق تعالیٰ نے واضح طور پر فرمادیا ہے:

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَّمِنكُمْ مُّؤْمِنٌ۔ (التغابن: ۲)

ترجمہ:- وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا سو تم میں بعض کافر ہیں اور بعض مومن۔

اس آیت نے بتادیا کہ اللہ کی نظر میں انسانوں کے اصل گروہ دو ہی ہیں ایک مؤمن اور دوسرا کافر، پوری دنیا میں انسانوں میں تحزب اور گروہ بندی صرف ایمان و کفر کی بنیاد پر ہو سکتی ہے، رنگ اور زبان، نسب و خاندان، وطن اور ملک میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو انسانی برادری کو مختلف گروہوں میں بانٹ سکے۔

(ملاحظہ ہو معارف القرآن ج ۸/ص ۴۶۳)

دوسری جگہ حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طرز عمل کی اتباع کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ۔

(الممتحنۃ: ۴)

ترجمہ:- تمہارے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام میں اور ان لوگوں میں جو ان کے شریک حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے جب کہ ان سب نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے علاوہ معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں، ہم

تمہارے منکر ہیں ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض (زیادہ) ظاہر ہو گیا (اور یہ عداوت ہم کو تم سے ہمیشہ رہے گی) جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ (ترجمہ از بیان القرآن)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہ مخاطب زبان اور نسل اور علاقہ ہر چیز میں ان کے ساتھ شریک تھے (اسی وجہ سے لفظ قومہ کا لفظ بولا گیا ہے) لیکن یہ اشتراک اپنائیت کا جذبہ پیدا کرنے سے قاصر رہا تھا جب تک کہ ایمانی اور دینی رشتہ نہ پیدا ہو جائے۔

نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی زندگی دیکھ لیجئے' قریشی وغیرہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے اپنے وطن' نسل اور خاندان سے تعلق رکھنے والے اپنی ہی زبان بولنے والے بلکہ اپنے باپ یا بھائی وغیرہ اگر مسلمان نہیں ہیں تو وہ غیر ہیں اور دور دراز کے علاقے اور بالکل دوسری نسل سے تعلق رکھنے والا ایک کالا غلام بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ محض اس وجہ سے اپنا بھائی بلکہ سیدنا بلال ہے کہ وہ بھی نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لے آیا ہے۔

مسلمانوں کی پریشانیوں کی اصل وجہ اسی اسلامی قومیت سے روگردانی اور ان کے مصائب اور بین الاقوامی مشکلات کا حل اسی مسلم قومیت کا احیاء ہے جس کی بنیاد پر تمام دنیا کے مسلمان خود کو ایک قوم کا فرد سمجھتے ہوئے ایک قیادت کے تحت جمع ہو جائیں اور اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کا عملی منظر پیش کریں۔ یہ منزل بظاہر مشکل تو نظر آتی ہے لیکن بہر حال ناممکن قرار نہیں دی جا سکتی۔

اس سے ہٹ کر مسلمانوں کے مسائل کا کوئی مستقل اور پائیدار حل نہیں سوچا جا سکتا۔ مشرق و مغرب' یمین و یسار وغیرہ کی تقسیم سے بالاتر ہو کر محض مذہب کی بنیاد پر اسلامی بلاک کا قیام صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں پوری دنیا کے لئے

پیغام راحت ثابت ہو گا۔

مسلمان صدیوں سے اس نظریہ سے غافل چلے آ رہے ہیں' قومیت وطنیت کے مختلف نعروں کے ذریعے مسلم قومیت کے تصور کو نقصان پہنچایا گیا' بالخصوص مصطفیٰ کمال کے ذریعے ترکی قوم کی ترقی و فلاح کے نام پر خلافت عثمانیہ کا الغاء اس قسم کی سازشوں کا نقطۂ عروج تھا' اس کے بعد خلافت کا خواب و خیال بھی مسلمانوں کے ذہنوں سے نکالنے کے لئے انہیں مختلف قسم کی قومیوں اور وطنیتوں میں الجھائے رکھا۔ عالم اسلام میں وطنیت و قومیت کے یہ داعی استعمار دشمنی کے نعرے بھی لگاتے رہے' (ممکن ہے کہ مسلمانوں کے نادان دوست کی حیثیت سے یہ کام وہ اخلاص ہی سے کر رہے ہوں) لیکن یہ حقیقت ہے کہ مغرب کی استعماری طاقتوں نے اسلامی ممالک پر اپنا استبدادی پنجہ وطنیت وغیرہ کے ان نعروں کے ذریعے اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کر کے اور مسلم قومیت کو دبا کر ہی مضبوط کیا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ کانگریس کے حامی مسلمان مرض کی صحیح تشخیص اور تجویز سے عاجز رہے' مغربی استعمار نے مسلمانوں کی جس طاقت کو دبا کر کامیابی حاصل کی تھی اس کی طرف ان حضرات نے مناسب توجہ نہیں فرمائی' مثلاً جمعیۃ علمائے ہند کی نمایاں شخصیت حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ایک رسالہ "آنے والے انقلاب کی تصویر" میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے کہ وہ ہندوستان کس لئے متحد رکھنا چاہتے ہیں اور مغربی قوتوں کی سرکوبی اور اسلامی ممالک کے مصائب کے حل کا طریقہ کیا ہے' اس سلسلے میں انہوں نے ایک مشورہ تو یہ دیا ہے کہ اس وقت دنیا میں دو بڑی طاقتوں کی جاری ہے یعنی اشتراکیت اور سرمایہ داری' مسلمانوں کو اشتراکی قوت کی حمایت حاصل کرنی چاہئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

"لیکن اشتراکیت کی حمایت اگر حاصل کر لیں ؎
تو وہ ان خطرات سے محفوظ رہتے ہیں (جو سرمایہ داری کی
حمایت کی صورت میں پائے جاتے ہیں) خود اشتراکیت کی
اصلاح بھی کر سکتے ہیں۔"

(آنے والے انقلاب کی تصویر ص ۲۱)

گویا دنیا کی عام روش سے ہٹ کر اور موجودہ گروہ بندیوں کو چھوڑ کر اسلامی قومیت کی بنیاد پر مسلمانوں بلکہ انسانوں کے مسائل کے حل کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی گئی' خود لکھتے ہیں کہ :

"دنیا کی بساط سیاست پر ان دو مہروں (اشتراکیت
وسرمایہ داری) کا اس قدر غلبہ ہو گیا ہے کہ مذہب کا سوال
پیچھے رہ گیا ہے۔" (ایضاً ص ۲۰)

گویا مذہب کا سوال پیچھے رہ گیا ہے تو اسے پیچھے رہنے دیا جائے اور ان دو مہروں میں سے کسی کی حمایت کی جائے۔ انقلاب انقلاب پکارنے والے اور فلک کل نظام کو اپنا نصب العین قرار دینے والے صورت حال جوں کی توں رکھنے پر رضا مند ہو گئے ہیں' قومیت وغیرہ سیاسی مسائل میں مذہب کا سوال آگے لا کر خود کوئی انقلابی قدم اٹھانے کی بجائے خود بخود جو انقلاب آ رہا ہے (روس کی طرف سے) اس کی "تصویر" دکھا کر حمایت کی دعوت دی جا رہی ہے شاید اس لئے کہ :

"روس کے انقلاب نے دنیا کے سامنے عجیب و
غریب تجربات کا مظاہرہ کیا۔ اس نے یہ سبق ہمیں اچھی طرح
ذہن نشین کرا دیا کہ ذاتی نفع اور راحت و آرام کے سامنے

؎ یہ ظاہر ہے کہ حمایت حاصل کرنے کے لئے حمایت کرنا بھی لازم ہے۔

مذہبی جذبات ماند پڑ جاتے ہیں۔ ؎ نیز یہ کہ جو طبقہ انقلاب
میں قربانیاں پیش نہیں کرتا انقلاب کے بعد سب سے پہلے اس
کو فناء کے گھاٹ اتارا جاتا ہے اس کو فنا کر دیا جاتا ہے ؎ یہی
سبق ہمیں مصطفی کمال کے کارناموں نے بھی سکھایا۔"

(آنے والے انقلاب کی تصویر ص ۱۸)

پھر یہ خواب دکھایا گیا کہ ہندوستان آزاد کرانے کے بعد ایشیائی طاقتوں کی ایک فیڈریشن بنائی جائے گی جس میں ہندوستان' ایران' افغانستان' سویت روس' چین اور جاپان شامل ہوں گے۔ یہ فیڈریشن اسلامی ممالک کے لئے قوت کا سامان ہو گی اور ایشیائی لیگ کی صورت میں ہماری طاقت تمام دنیا پر چھا جائے گی اور یورپ قرون اولیٰ کی طرح پھر نکبت اور افلاس کے جمود میں قدیم وحشت کی طرف عود کر جائے گا۔ (ایضاً ص ۲۴)

قطع نظر اس کے کہ اس قسم کی فیڈریشن کا عملی وجود ممکن بھی ہے یا محض شیخ چلی کا خواب ہے' یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیسے یقین کر لیا گیا کہ یہ فیڈریشن مسلمانوں اور اسلام کے لئے بہر حال مفید ہی ہو گی اور اس کی طاقت "ہماری طاقت" ہو گی۔ یہاں بھی در حقیقت وہی غلط مفروضہ کار فرما ہے کہ مسلمانوں کی طرح ان کافر اقوام کی انگریز دشمنی بھی مستقل اور دائمی ہے اس میں حالات کے بدلنے سے تبدیلی نہیں ہو سکتی' پھر اصل مقصود کفر کی شکست کی بجائے صرف یورپ کی

؎ غالباً مطلب یہ ہے کہ جب اشتراکیت لوگوں کو معاشی خوشحالی دلائے گی تو لوگ مذہب کی بات نہیں سنیں گے اس لئے خیر منانی ہے تو ایسے معاملات میں مذہب کا سوال نہ کھڑا کیا جائے لیکن جہاد افغانستان نے اس سوچ کو غلط ثابت کرتے ہوئے مذہبی جذبات کی قوت واضح کر دی ہے۔

؎ کاش کہ تحریک پاکستان والے انقلاب کے بارے میں بھی یہی بات محسوس کر لی جاتی۔

شکست کو بنا لیا گیا' صرف یورپ و مغرب ہی کو مکمل شکست سے دو چار کرنا اور اسے عالمی اثر و رسوخ سے محروم کرنا ہو بھی تو اس کا راستہ صرف اور صرف اسلامی قومیت کا احیاء اور عالم اسلام کو متحد کر کے اسلامی بلاک کا قیام ہے اور یہ کام اپنی تمام تر مشکلات کے باوجود اس بھان متی کے کنبے کی تشکیل سے بہر حال آسان ہے جسے یہ حضرات تجویز کر رہے تھے۔

حاصل یہ کہ مسلم قومیت کا نظریہ قرآن و سنت کے عین مطابق اور اس کا احیاء وقت کی اہم ترین ضرورت تھا۔ دو قومی نظریہ اور تحریک پاکستان کی حمایت در حقیقت ایک باطل نظریئے کے مقابلے میں ایک صحیح نظریہ کی حمایت تھی دوسری طرف کے اکابر رحمہم اللہ کی دیانت دارانہ رائے کے مطابق وہ مصالح زیادہ اہم تھے جو وہ متحدہ ہندوستان سے حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن کانگریس کی مخالفت کرنے والے حضرات نے زیادہ اہمیت اس بات کو دی کہ کون سا نظریہ اوفق بالقرآن والسنۃ ہے۔ صحیح نظریہ کے احیاء وبقاء کو ان حضرات نے زیادہ اہم خیال کیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد عوامی سطح پر مسلم قومیت کی آواز بلند ہوئی تھی' یہ موقع ضائع کرنا کسی طرح مناسب نہیں تھا گو مسلم لیگ کی حمایت کے ذریعے فوری طور پر اسلامی قومیت کے مکمل احیاء اور اس کے تقاضوں کی تکمیل کے امکانات نہیں تھے' (کچھ تو مسلم لیگ کی اپنی خامیوں کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ عالم اسلام کے ذہن اس کے لئے مکمل طور پر ہموار نہیں ہوئے تھے حتیٰ کہ جیسا کہ عرض کیا گیا بعض علماء بھی روسی انقلاب کی حمایت اور ایشیائی لیگ وغیرہ میں اپنی مراد ڈھونڈھ رہے تھے) لیکن بہر حال دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ایک اسلامی مملکت کا قیام اس منزل کی طرف اولین قدم اور اس کے لئے خشت اول ضرور تھا۔ اسی لئے حقیقت میں انگریز کسی بھی

صورت میں قیام پاکستان کی حمایت نہیں کر سکتے تھے۔ (بالفرض اگر کسی نے ایسا کیا ہے تو وہ اپنی قوم کا نادان دوست تھا) تحریک پاکستان کے دور کے معروف صحافی جناب حسن ریاض مرحوم کی یہ بات بالکل درست ہے کہ:

"انگریزوں کے دل سے اس بات کا قلق کسی طرح نہیں جاتا تھا کہ ان کی یہ ڈیڑھ سو سال کی تمنا پوری نہیں ہو سکتی کہ ہندوستان ایک مرکزی حکومت کے تحت ایک ملک رہے مگر وہ یہ چاہتے کیوں تھے اور کوشاں کیوں تھے؟ ہندوؤں کے ساتھ دوستی کے لئے؟ ہرگز نہیں؟ مسلمانوں کے ساتھ تاریخی رقابت کی وجہ سے؟ یقیناً! کہ ان کی تہذیب اور ان کے تمدن میں عالمگیر ہونے کی بے انتہا صلاحیت ہے' جس دن مسلمانوں میں اس کا شعور پیدا ہو گیا اور اسلامی تہذیب اور کلچر کے محاسن نمایاں کرنے پر وہ کمر بستہ ہو گئے اسی دن سے مغربیت پسپا ہونے لگے گی۔"

(پاکستان ناگزیر تھا ص ۵۰۶)

(۵) احیاء جہاد کا راستہ بھی مسلمان ریاست کا قیام تھا

جہاد صرف ایک اسلامی فریضہ ہی نہیں بہت سے فرائض کے قیام اور رفع مصائب کا ذریعہ ہے' اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کو ذروۃ سنام الاسلام (اسلام کی کوہان کا بلند حصہ) قرار دیا ہے۔ ایک طویل عرصہ سے مسلمان اس فریضہ

میں غفلت اور کوتاہی کے مرتکب چلے آرہے تھے۔ ✽ حضرت حکیم الامتؒ کی یہ شدید خواہش تھی کہ مسلمانوں کی یہ کوتاہی دور ہو اور وہ اس مقدس فریضہ کی طرف رجوع کریں۔ چنانچہ حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ (جو کہ آپ کے برادرزادہ، بچپن سے آپ کے تربیت یافتہ اور خانقاہ تھانہ بھون کے ناظم تھے) مفتی اعظم قدس سرہٗ کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ: (گویا اشرفی دربار کا ایک رازدار دوسرے رازدار کے نام نجی خط میں لکھ رہا ہے:)

"آپ بڑے ابا (حضرت تھانویؒ) کے حالات سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں کہ ان کو کس قدر تمنا تھی جہاد کی، حضرت شیخ الہندؒ اور بڑے ابا میں اختلاف صرف وقت آ جانے یا نہ آنے کا تھا۔"

(ماہنامہ البلاغ مفتی اعظم نمبر ص ۱۲۵۰)

گویا حضرت جہاد کی اس قدر شدید تمنا کے ساتھ ساتھ اس کے لئے خاص وقت کے منتظر تھے۔ حضرت کے ایک خلیفہ اور پاکستان میں مجلس صیانۃ المسلمین کے بانی حضرت مولانا جلیل احمد شیروانی قدس سرہٗ نے اپنی کتاب "آثار رحمت" میں حضرت کے تجدیدی کارنامے اور نظریات بیان فرماتے ہوئے اہتمام جہاد کو سب

✽ بلکہ جہاد کے ٹھیٹھ مذہبی اور دینی تصور کو پس پشت ڈال کر اسے خالص سیاسی یا اقتصادی انقلاب اور مجرد قسم کے عدل وانصاف کے عمومی اصولوں کی خاطر محنت کا رنگ دیا جاتا رہا تھا حتیٰ کہ ایک عالم تو یہاں تک لکھ گئے کہ ہمہ گیری، حق وصداقت کے لئے انسانی شرف وعظمت کے نام پر جدوجہد اسی وقت جہاد ہے جب کہ نہ قومی یا نسلی اقتدار کا تصور سامنے ہو اور نہ ہی فرقہ پرستی اور دھڑے بندی کی کوئی شکل کسی فتنہ وفساد کی تخم ریزی کر سکے۔ (شاندار ماضی ج ۲/ص ۱۹) اس قسم کے سیاق میں عموماً فرقہ پرستی سے مراد مسلم، ہندو، سکھ وغیرہ کا اختلاف ہوتا ہے، اگر خدانخواستہ یہی مراد ہے تو یہ نظریہ جہاد میں تحریف کی بدترین مثال ہے۔

سے زیادہ اہمیت دی ہے اور مذکورہ کتاب کا دوسرا حصہ اسی موضوع پر ہے، اس میں آپ فرماتے ہیں:

احقر بعونہ تعالیٰ تیرہ چودہ سال مستقل طور پر محی السنۃ حکیم الامت مجدد الملۃ مرشدی حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب قدس سرہٗ کے دربار گہربار میں مستقل حاضر رہا۔ اس زمانہ میں احقر نے وقتاً فوقتاً خود اس کا مشاہدہ کیا کہ جب مسلمانوں پر کفار کے ظلم وستم کا بیان ہوتا تو حضرت حکیم الامتؒ پر ایک خاص کیفیت کا ورود مشاہدہ کیا جاتا۔ آنکھیں سرخ نظر آنے لگتیں اور حاضرباش کو بداہۃً محسوس ہوتا تھا کہ حضرتؒ بے چینی کے ساتھ کسی چیز کے متمنی اور کسی وقت کے منتظر ہیں۔ ایک بار قرب وجوار کے ایک مسلمان نے کسی اپنی مستعدی کا مظاہرہ کیا، مسکرا کر فرمایا کہ اچھا اگر ضرورت ہوئی تو تم سے بھی جہاد کا کام لیں گے ---- ایک بار صوبہ سرحد کی طرف سے ایک (خادم درویش) والی ریاست نے تعلقات دوستانہ کو جو حضرتؒ کے ساتھ رکھنا چاہتے تھے وسیع کرنا چاہا تو حضرتؒ نے اس سے عذر ظاہر فرمادیا مگر یہ فرمایا کہ ہاں وقت آئے گا تو ایک کام یعنی جہاد کا کام آپ سے لیا جائے گا غرض کہ یہ بات بدیہی تھی کہ شوق جہاد میں حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ چور رہتے تھے۔" (آثار رحمت ص ۱۰۸)

اس کتاب میں حضرت کے ارشادات کی روشنی میں دلائل شرعیہ سے اس فریضہ کی اہمیت کو ثابت کیا گیا ہے۔

مگر جہاد کی اس اہمیت کے ساتھ ساتھ حضرتؒ کی یہ بھی رائے تھی کہ جہاد کے لئے مسلمانوں کا ایک مستقل مرکز ہونا چاہئے۔ چنانچہ حضرت مولانا جلیل احمد قدس سرہ ہی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مسلم لیگ کے ایک بڑے جلسے میں حضرتؒ کی طرف سے تحریری بیان پڑھ کر سنایا گیا۔ بیان تیار کرنے والے حضرات بیان لکھ کر لائے تو اس میں اتباع شریعت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ان لوگوں کو ملاحدہ یورپ کے مقلد کہا گیا تھا جو کہتے ہیں کہ خالی نماز' روزہ سے کیا ہوتا ہے' حضرتؒ نے اس مضمون کے اس جزء کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا:

"جیسے یہ غلط ہے کہ نماز' روزہ کو کامیابی میں کیا دخل؟ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ خالی نماز' روزہ کامیابی کے لئے کافی ہے بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز' روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ چیز قتال و جہاد ہے' کیا مکہ میں نماز' روزہ نہ تھا' بھلا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بڑھ کر نماز' روزہ کس کا ہو سکتا ہے؟ مگر باوجود اس کے دیکھ لیجئے کہ مکہ کے اندر مسلمان اتنے دنوں تک رہے مگر غلبہ نہ ہوا' جب ہجرت ہوئی' قتال ہوا اس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اٹھا کر دیکھ لو کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ خالی نماز' روزہ سے مسلمانوں کا غلبہ ہوا ہو البتہ ضروری نماز' روزہ بھی ہے۔" (آثار رحمت ص ۱۱۳)

پھر اس مضمون کو دلائل سے ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے اور یہ میری رائے آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے۔"

(آثار رحمت ص ۱۱۷)

حضرت مولانا جلیل احمد صاحب رحمہ اللہ اس کے بعد مکالمہ نقل فرماتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"اس کے بعد حضرت حکیم الامتؒ نے احقر سے ارشاد فرمایا کہ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ باوجودیکہ بغیر قتال کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو نہ غلبہ ہو سکتا تھا نہ ہوا' مگر تیرہ برس مکہ میں گزر گئے اور سخت سے سخت ایذائیں مسلمانوں کو پہنچیں لیکن قتال کی اجازت نہ ہوئی۔۔۔۔۔ احقر (حضرت مولانا جلیل احمد صاحب رحمہ اللہ) نے عرض کیا کہ حضور اس کی کیا وجہ تھی کہ قبل ہجرت کے مسلمانوں کے پاس ہتھیار اور سامان نہ تھا؟ ارشاد فرمایا کہ اجی! ہتھیار تو خود مقابل ہی سے لے لئے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ احقر نے عرض کیا کہ حضور پھر کیا وجہ تھی؟ ارشاد فرمایا کہ! (گو بجز قلت سامان کے دوسرے مصالح بھی ہوں' مثلاً ایمان کی قوت والے افراد پر مشتمل جماعت کی تیاری مگر) میرے نزدیک اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مکہ میں مسلمانوں کا کوئی مرکز نہ تھا اور جہاد کے لئے مرکز ضروری ہے اور ہجرت کے بعد مسلمانوں کو مدینہ پہنچ کر مرکز حاصل ہو گیا۔۔۔۔۔ مگر اس وقت بھی دشواری یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز نہیں لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا مرکز قائم ہو۔"

(آثار رحمت ص ۱۲۰)

حاصل یہ کہ حضرتؒ مسلمانوں کی الگ مملکت کی ضرورت کے اس لئے بھی قائل تھے کہ احیاء جہاد کے لئے اس کی ضرورت تھی بلکہ اس نقطۂ نظر سے دیکھا

جائے تو حضرتؒ کے سیاسی نظریات اور سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریک جہاد میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ پاکستان کا قیام اور جہاد افغانستان وغیرہ میں اس کا بے مثال کردار بھی انہی شہداء کی قربانیوں کا ثمر معلوم ہوتا ہے۔

(۶) مسلمان حکومت کا قیام شرعاً بذاتِ خود مقصود ہے

کسی بھی علاقہ پر مسلمان حکومت (خواہ وہ کتنی ہی بری کیوں نہ ہو) کا وجود یا بقاء اسلامی سیاست میں بذاتِ خود مقصود ہے اور یہ مقصود صالح اسلامی حکومت کے قیام سے الگ ہے۔ اگر کہیں پہلے مقصد کے حصول کا موقع ہو تو اس کو محض اس وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرا مقصد حاصل نہیں ہو رہا۔ احادیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ جہاد کے مسئلہ میں امام اور حاکم کے عادل یا فاسق ہونے سے فرق نہیں پڑتا' ہر حالت میں اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے گا۔ اس کا بھی ایک منشا یہی ہے کہ کسی علاقہ سے ولایت کفار ختم کر کے اسے ولایت مسلمین میں لانا یہ حکومت اسلامیہ عادلہ کے قیام کے علاوہ ایک مستقل مقصد ہے۔

اسلامی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ جب کسی علاقہ سے تسلطِ کفار ختم کرانے کے لئے جہاد کا موقع آیا تو بڑے بڑے اکابر نے فاسق اور عیاش یا جابر قسم کے حکمرانوں کا بھی ساتھ دیا اور یہ نہیں سوچا کہ فتح اور جہاد میں کامیابی کی صورت میں اس علاقہ کے جو مسلمان حکمران ہوں گے وہ کس قسم کے ہوں گے (یعنی اس سوچ کو جہاد کے راستہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا گیا' گو حسب موقع مسلمان حکومتوں کے ظلم وستم کے خاتمے کی کوشش میں بھی دریغ نہیں کیا)۔ خود آخری دور کے مغلیہ حکمرانوں کی زندگیاں اور طریقے کوئی قابل رشک نہیں تھے۔

شاید آج کے حکمران بہت سی چیزوں میں ان سے بہتر ہوں اس کے باوجود اس سلطنت کی حفاظت کے لئے انگریزوں کے خلاف جو کچھ ہو سکتا تھا کیا۔ ترکی سلطنت کے بارے میں بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ چنانچہ حضرت مفتی اعظم پاکستان قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:

> "یہی وجہ ہے کہ موجودہ ترکی سلطنت اور اس کے ارکان کی خلاف شرع کارروائیاں اور بد عملی جو مسلم لیگ اور اس کے ارکان کی بد عملی سے کہیں زیادہ اور سب کے نزدیک مسلّم ہے لیکن ہندوستان کے ہر طبقہ کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند اور عامۃ المسلمین نے بمقابلہ کفار ان کی نصرت و حمایت کو ضروری سمجھا اور حسب استطاعت اس میں حصہ لیا۔"
>
> (جواہر الفقہ ج ۲ / ص ۲۴۴)

ہندوستان ایک طویل عرصہ تک مسلمان حکمرانوں کے ماتحت دار الاسلام رہ چکا تھا۔ انگریزی تسلط کے بعد یہ دار الحرب بن گیا تھا' انگریز کے چلے جانے کے بعد فوری طور پر پورے ہندوستان میں مسلمان حکومت کا قیام ظاہر ہے کہ ممکن نہیں تھا۔ ہاں البتہ اس کے ایک حصہ پر یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا تھا' اسی شرعی مقصد کے حصول کے لئے قیام پاکستان کی حمایت کی گئی تھی۔ چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

> "اس تفصیل کے بعد پاکستان کی شرعی حیثیت بالکل واضح ہے کہ ہندوستان جو صدیوں تک دار الاسلام رہا ہے اور اب ایک عرصہ سے اس پر غیر مسلم حکومت کا تسلط ہے اور بہت سے خلافِ شرع قوانین نافذ ہیں اور مسلمانوں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں لہٰذا مسلمانوں کے ذمہ واجب

ہے کہ اس تسلط کے ازالہ یا تقلیل کی جو صورت جس حصہ ملک میں وہ کسی تدبیر سے حاصل کر سکیں اس میں کوتاہی نہ کریں کہ یہ بھی استخلاص دار الاسلام کی ایک فرد ہے۔"

(جواہر الفقہ ج ۲ / ص ۲۴۷)

باقی جہاں تک پورے ہند پر حکومت مسلمہ کے قیام کا تعلق ہے (جیسا کہ انگریزی تسلط سے پہلے تھا) تو فوری طور پر تو اس کا امکان نہیں تھا۔ آئندہ اس مقصد کے حصول کا راستہ بھی صرف مسلمانوں کا الگ مرکز قائم کر کے جہاد کی تیاری کرنا تھا۔

(۷) خطے میں نفاذ اسلام کی طرف پہلا قدم بھی متحدہ ہندوستان کی بجائے قیام پاکستان تھا

ایسی حکومت صالحہ عادلہ کا قیام جو قرآن و سنت کے مطابق ہو یہ بھی ایک اہم مقصد ہے۔ پاکستان کے قیام سے فوری طور پر اس مقصد کے حصول کی خوش فہمی میں کوئی بھی مبتلا نہیں تھا، لیکن متحدہ ہندوستان کی صورت میں اس مقصد کے حصول کا کوئی بھی امکان نہیں تھا۔ اب دو ہی راستے تھے یا تو اس مقصد کو سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا یا اس مقصد کے حصول کے لئے الگ مسلمان حکومت کے قیام کی کوشش کی جاتی، پھر بعد میں اسے اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی فکر کی جاتی۔ پہلا کام دوسرے کام کے لئے سیڑھی اور ابتدائی قدم کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر تمام علماء متحدہ طور پر قیام پاکستان کی کوشش میں شامل ہو جاتے تو دونوں قدم اکٹھے ہی اٹھ سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ اس لئے اس وقت دانشمندی کا تقاضا یہی تھا کہ پہلا قدم ہی اٹھا لیا جائے اور کسی وقت حق تعالیٰ دوسرے مقصد کے لئے اسباب پیدا فرما دیں گے۔ حاصل یہ کہ حکومت صالحہ عادلہ کا راستہ بھی قیام پاکستان ہی تھا۔

ان گزارشات سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ جن حضرات اکابر رحمہم اللہ نے مسلم لیگ اور قیام پاکستان کی حمایت کی تھی انہوں نے یہ اقدام محض مسلم لیگ کے دلفریب وعدوں اور بلند بانگ نعروں پر اعتماد کر کے نہیں کیا تھا بلکہ بہت سے واقعات اور شرعی دلائل کی بنیاد پر ان حضرات نے یہ رائے قائم فرمائی تھی۔ کسی کو اس رائے سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اسے ایک مستقل نظریہ تسلیم کرنے کی بجائے چند لوگوں پر اعتماد کلی کا نتیجہ قرار دینا حقائق کا منہ چڑانا ہے۔

کیا واقعات نے قیام پاکستان کا غلط ہونا واضح کر دیا ہے؟

قیام پاکستان کے بعد جو افسوس ناک صورت حال سامنے آئی اور بناء پاکستان کے مقاصد کے حصول میں تعویق و تاخیر کا سلسلہ جس طرح دراز ہوتا چلا گیا اس سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ چھیالیس سالہ تجربہ قیام پاکستان کے اقدام کا درست ہونا ثابت نہیں کر سکا بلکہ اس کے برعکس ان حضرات کی اصابتِ رائے واضح ہو گئی ہے جنہوں نے قیام پاکستان کی حمایت نہیں کی تھی اس لئے کہ جو خدشات ان حضرات کی طرف سے پیش کئے جاتے تھے وہ سارے درست ثابت ہوئے، لیکن اس سلسلے میں صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دونوں طرف کے حضرات نے جو راستہ اختیار کیا اسے خیر محض اور مثالی راستہ سمجھ کر اختیار نہیں فرمایا بلکہ اہون البلیتین سمجھ کر اسے دوسرے پر ترجیح دی تھی۔ گویا دونوں طرف کے حضرات دونوں کے فی الجملہ "بلیہ" ہونے پر متفق تھے (اصل مثالی راستہ تو یہ تھا مسلمانوں کی الگ تنظیم اور الگ اسلامی ریاست اکابر علماء کی قیادت میں وجود میں آتی) اس لئے دونوں پر کچھ نہ کچھ مفاسد کا مرتب ہونا لازمی امر تھا۔ لیکن تقسیم ہند کے حق میں فیصلہ ہو جانے کی وجہ سے اس طرف کے مفاسد عملاً ہمارے سامنے آ گئے اور دوسرے راستہ کے مفاسد کا مشاہدہ نہیں ہوا، اس لئے ان کا سمجھنا اور اندازہ لگانا ذرا مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے موجودہ مفاسد کو دیکھ کر بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ شاید قیام پاکستان مسلمانان برصغیر کی غلطی تھی۔

چونکہ دونوں صورتوں میں کچھ نہ کچھ مفاسد کا مرتب ہونا اور کا[illegible] صرف مسلم لیگ کی طرف سے وعدہ خلافی اور طوطا چشمی کا سامنے آنا ایک لازمی امر تھا، اس [illegible] لئے دیکھنے کی اصل بات یہ تھی کہ اصولی طور پر کون سا راستہ زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ سے کسی نے اس بات کا شکوہ کیا کہ انہی لوگوں کی طرف سے مسلمانوں کو ایذائیں پہنچائی جارہی ہیں جنہوں نے تحریک آزادی میں ان کا ساتھ دیا تھا تو حضرتؒ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"آزادیٔ ہند کے متعلق جن لوگوں کا ساتھ دیا اور طرح طرح کی اذیتیں جھیلی تھیں آج ان لوگوں کے اس دل خراش رویہ کی جو انتہائی درجہ وحشیانہ ہے جناب کو شکایت ہے؟ محترما! یہ شکوہ جب ہو سکتا ہے جب کہ آپ نے ان لوگوں پر احسان کیا ہوتا حالانکہ واقع برعکس ہے۔"

کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں:

"خلاصہ یہ کہ آزادیٔ ہند اور انگریزی اقتدار کا مٹانا مسلمانوں کا اولین فریضہ تھا اور ہندوؤں کا ثانوی۔ مسلمانوں کی تحریک آزادی میں شرکت کسی دوسرے پر احسان نہ تھی۔ اگرچہ اس حیثیت کے پیش نظر کہ اگر مسلمان شریک نہ ہوتے تو ہندو کامیاب نہ ہوتا اس کو احسان کہا جا سکتا ہے مگر حقیقت اور ہے۔"

(مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ / ۱۹۳، ۱۹۴)

اسی طرح شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ کے اندر جمعیۃ علماء اسلام کی ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مسلم لیگیوں کی طوطا چشمی اور مطلب برآری کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"حصول پاکستان کے بعد علماء و مشائخ کی ان
مساعی عظیم کو ارباب اقتدار نے قطعاً فراموش کر دیا ہے'
مذہبی طبقہ کی خدمات جلیلہ کا اعتراف تو درکنار' نشر و
اشاعت کے ان ذرائع سے جو حکومت کے دامن سے وابستہ
ہیں اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ مذہبی عنصر زیادہ
چمکنے یا ابھرنے نہ پائے اور جہاں تک ہو سکے اسے کس مپرسی
اور خمول ہی کی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ
وقت پڑنے پر علماء کو احمق بنالیا جاتا ہے' جب کام نکل گیا تو
ان سے کوئی تعلق نہیں۔"

"میں بالکل صفائی سے بتلا دینا چاہتا ہوں کہ یہ
صورت حال ہمارے لئے غیر متوقع چیز نہیں تھی۔ ہم یقینا
پہلے سے جانتے تھے کہ ایسا ہوگا اور پاکستان کی زمام اقتدار کا
حالت موجودہ جن ہاتھوں میں پہنچنا ناگزیر تھا ان سے اس
کے سوا کوئی توقع کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ ہم ان کی نسبت
عند اللہ کسی فریب میں مبتلا نہ تھے۔ ہم نے یہ سب کچھ
جانتے اور سمجھتے ہوئے جداگانہ قومیت اور اصول پاکستان کی
مخلصانہ حمایت مذہبی نقطۂ نظر سے حق اور صحیح سمجھ کر کی اور
آئندہ بھی انشاء اللہ اس کی حفاظت کے معاملہ میں رجال
حکومت کی کوئی ناپسندیدہ روش ہماری جدوجہد پر اثر انداز
نہیں ہو سکتی۔"

(تعمیر پاکستان اور علماء ربانی ص ۱۵۴'۱۵۵)

ان دو اقتباسات سے معلوم ہوا کہ دونوں بزرگ اس بات پر متفق ہیں کہ

دونوں طرف سے پیش آنے والی بے وفائیوں کی مذمت تو ہونی چاہئے لیکن صرف
اسی کو بنیاد بنا کر کسی فیصلہ یا طرز عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا' بلکہ
اس کے لئے دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ اصولی طور پر کون سا راستہ درست تھا۔ جن
حضرات نے متحدہ قومیت اور اس کی بنیاد پر قیام پاکستان کی حمایت کی تھی ان کے
نزدیک اصولاً یہ بات درست اور متحدہ قومیت کا نظریہ اصولاً غلط تھا۔

دوسری بات یہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ دونوں طرف کے اکابر میں سے
جس نے جس کی حمایت کی وہ اسلام اور مسلمانوں کے بہت سے مفادات پیش نظر
رکھ کر کی' لیکن ان میں سے کوئی فریق بھی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ یہ مقاصد و مفادات
متحدہ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی یا پاکستان کے وجود میں آتے ہی حاصل ہو جائیں
گے بلکہ دونوں طرف کے حضرات یہ سمجھتے تھے کہ ان مقاصد کے لئے الگ
جدوجہد کرنا ہوگی' چنانچہ حضرت مدنی قدس سرہ کی یہ رائے پہلے نقل کی جا چکی ہے
کہ اصل مسئلہ انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کا ہے' ہندوستان میں مسلمانوں کے
مفادات کا تحفظ بعد کا کام ہے' اسی طرح ایک مکتوب گرامی میں حضرت مدنی قدس
سرہ فرماتے ہیں:

"اب یہ خود مسلمانوں کی حکمت تبلیغ پر منحصر
ہے کہ وہ آنے والے نظام کو کس حد تک اسلامی معیار پر
ڈھال سکتے ہیں۔" (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۳/ص ۹۱)

اسی مکتوب میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

"بلاشبہ اسلامی قوانین ہی دنیا کے لئے حقیقی امن
و سلامتی کے ضامن ہیں۔ ہندوستان کی مشترکہ حکومت
میں ان قوانین کی حاکمیت مطلقہ قائم نہیں ہوگی اور نہ حدود
شرعیہ جاری ہوں گی لیکن یہ خود مسلمانوں کا علمی و عملی

فریضہ ہے کہ وہ دوسری قوموں سے اسلامی قوانین کی یہ
حیثیت تسلیم کرالیں [*] اہون البلیتین آخری منزل مقصود
نہیں ہوتی۔" (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲/ص ۹۳)

اسی طرح حضرت علامہ عثمانی رحمہ اللہ سے بھی یہ نقل کیا جاچکا ہے کہ وہ قیامِ پاکستان سے قبل بھی مسلم لیگ کے رویہ کے بارہ میں زیادہ خوش فہمی کا شکار نہیں تھے۔ یہ بات ان کے ذہن میں بھی تھی کہ پاکستان بنتے ہی سارے کام خود بخود نہیں ہو جائیں گے بلکہ اسے صحیح معنی میں پاکستان بنانے کے لئے مستقل زبردست جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔ گویا دونوں طرف کے حضرات کے نزدیک آزادی کے بعد جدوجہد کا ایک نیا مرحلہ شروع ہونے والا تھا جس کی کامیابی یا ناکامی کا مدار کافی حد تک اس مرحلے میں اختیار کردہ حکمت عملی پر ہوگا۔

قیام پاکستان سے جنگ ختم نہیں ہوئی بلکہ محاذ تبدیل ہوا ہے، پہلے ہماری جنگ ہندو اور انگریز سے تھی جن کی یہ خواہش تھی کہ اسلام کے نام پر الگ ریاست وجود ہی میں نہ آئے، یہ محاذ فتح کر لینے کے بعد جنگ کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگیا جس میں ہمارا مقابلہ ان لوگوں سے ہے جو اس ملک میں اسلام کا نفاذ نہیں چاہتے۔ اس مرحلے کا طویل اور مشکل ہونا ایک فطری امر تھا اور جو لوگ دینی طبقے کی کوششوں میں رکاوٹ ہیں وہ ظاہر ہے کہ متحدہ ہندوستان کی صورت میں بھی مسلمانوں کی صفوں میں موجود ہوتے، اس طوالت اور مشکل سے جھنجلا کر یہ کہنا کہ ہم نے پہلا مورچہ فتح کر کے غلطی کی ہے کوئی بلند اور جرأت مندانہ سوچ کی عکاسی نہیں کرتا۔

جب کچھ اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے سفر شروع کیا جائے اور ان

---

[*] اکثر اسلامی ملکوں میں خود مسلمان حکمرانوں سے حیثیت تسلیم کرانا مشکل نظر آتا ہے۔ دوسری قوموں سے تسلیم کرانے کے امکانات کیا ہو سکتے ہیں)

مقاصد کا کچھ حصہ حاصل کیا جاچکا ہو اور کچھ کے لئے جدوجہد ابھی جاری ہو تو غیر حاصل شدہ مقاصد کی وجہ سے نہ تو حاصل شدہ مقاصد کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس ساری جدوجہد کو غلط قرار دیا جاسکتا ہے۔ ماضی قریب میں اس کی واضح مثال جہاد افغانستان ہے۔ جب اس جہاد سے بہت سے فوائد کی توقع کی جارہی تھی، مثلاً یہ کہ اس کے ذریعے سے اسلامی ممالک کی طرف بڑھتے ہوئے اشتراکیت اور کھلی دہریت کے سرخ سیلاب کو روک لیا جائے گا اور یہ کہ اس کے ذریعے سے پوری دنیا میں فریضہ جہاد کا احیاء ہوگا اور یہ کہ اس کے نتیجے میں ایک مثالی اسلامی حکومت قائم ہوگی وغیرہ وغیرہ اور الحمد اللہ ان میں سے بعض مقاصد حاصل ہو چکے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ افغانستان پر روسی حملے سے جو فریضۂ جہاد مسلمانوں پر عائد ہوا تھا وہ ادا ہوگیا۔ دوسرے اشتراکیت اور الحاد کا یہ سیلاب نہ صرف یہ کہ رک گیا بلکہ ایسا پسپا ہوا کہ اس کا اپنا مرکز اس کے لئے قبرستان ثابت ہوا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ فتح افغانستان کے بعد دشمن کی سازشوں سے وہاں انتہائی ناپسندیدہ واقعات بھی رونما ہو رہے ہیں [*] مجاہدین کی آپس کی لڑائی اور ایک دوسرے پر زبردست حملوں کی خبریں آتی رہتی ہیں لیکن کسی بھی ہوش مند شخص سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس ناپسندیدہ صورت حال کو دیکھ کر یہ کہے کہ روس اور اس کی کٹھ پتلی حکومت کے خلاف جہاد کرنا ہی غلط تھا اور روسی استعمار کو افغانستان، پاکستان اور تمام اسلامی ممالک میں اپنے پنجے گاڑنے کا موقع دے دینا چاہئے تھا۔ چونکہ فلاں فلاں مقاصد حاصل نہیں ہوئے اس لئے فلاں فلاں کا حصول بھی غلط تھا۔

قیام پاکستان کے محرکات بیان کرتے ہوئے یہ عرض کیا گیا تھا کہ یہاں دو

---

[*] یہ سطور اس دور میں لکھی گئی تھیں جب طالبان رونما نہیں ہوئے تھے اور افغانستان افغان لیڈروں کے اختلافات کی وجہ سے خانہ جنگی کا شکار تھا۔

مقصد الگ الگ ہیں: ایک مسلمان ریاست کا قیام' یعنی جتنے خطے میں ممکن ہو مسلمانوں کا مکمل اقتدار حاصل کر لیا جائے' دوسرے اس ملک کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جائے۔ قیام پاکستان سے پہلا مقصد تو حاصل ہو گیا اور دوسرے مقصد کے لئے جدوجہد کا میدان مل گیا۔ دوسرے مقصد کے حصول میں اگر ابھی تک کامیابی نہیں ہو سکی تو اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ پہلے مقصد کا حصول بھی غلط تھا۔ اگر چھت پر چڑھنے کے لئے ایک سیڑھی کسی نے بنادی ہے تو باقی سیڑھیاں بنانے کی فکر تو کرنی چاہئے لیکن جو بن چکی ہے اس کے وجود ہی کو غلط قرار دینا تو کسی لحاظ سے بھی درست نہیں ہے۔

کیا یہ اس دور کا اہم ترین واقعہ نہیں کہ جس وقت پوری دنیا کے سیاسی بازار میں وطنی قومیت کا سکہ ہی رائج ہے' اچھے اچھے لوگ بھی یمین و یسار' مشرق و مغرب' یورپ و ایشیا وغیرہ کے چکروں سے نکل نہیں پا رہے ہیں' خلافت عثمانیہ بھی اسی وطنیت کی بھینٹ چڑھ چکی ہے ایسے وقت میں بت کدۂ ہند سے **الکفر ملة واحدة** اور **اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ** کی بنیاد پر اسلامی قومیت کی آواز اٹھتی ہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں خالص مذہب کے نام پر ایک ریاست وجود میں آجاتی ہے۔ گویا صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ کروڑوں مسلمانوں نے دنیا کے سامنے یہ اعلان کیا کہ لسانیت' علاقائیت' نسل وغیرہ کے علاوہ دنیا میں قومیت کا ایک اور اہم معیار بھی موجود ہے اور وہ ہے اسلام' کیا ان حالات میں اس اعلان کی کوئی اہمیت نہیں؟

کیا ہم مصر' الجزائر' تیونس وغیرہ کی آزادی کو ایک مستحسن واقعہ نہیں سمجھتے؟ کیا وسطی ایشیا کی ریاستوں کی آزادی پر ہم خوش نہیں ہیں؟ کیا وہاں اسلامی قوانین نافذ ہو چکے ہیں؟ کیا اس آزادی پر خوش ہونے کی صرف یہی وجہ نہیں کہ کچھ نئے علاقوں میں مسلمانوں کے ملک وجود میں آگئے ہیں اور اگر کوئی اچھی توقع وابستہ کی جا سکتی ہے تو انہی سے کی جا سکتی ہے تو قیام پاکستان پر یہ چیز کیوں صادق نہیں

آتی؟ کم از کم اسی نقطۂ نظر سے کہ اسے ایک اچھا اقدام کیوں تصور نہیں کر لیا جاتا؟

عموماً شکوہ کیا جاتا ہے اس میں اسلام کے عدم نفاذ کا اور اس بنیاد پر اس ملک کے حصول ہی کو غلط ٹھہرایا جاتا ہے لیکن کیا اس استدلال کی بنیاد پر کبھی مصر' عراق' لیبیا' الجزائر وغیرہ تمام اسلامی ممالک کی آزادی کو اس بنیاد پر غلط قرار دیا گیا ہے کہ وہاں کی دینی صورت حال قابل رشک نہیں ہے حالانکہ آزادی کے وقت وہاں بھی مذہبی جذبات سے استفادہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اسے اس دور کی سیاست کا عمومی ظاہرہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "یہ تاریخ کا عجیب المیہ اور سیاست کی عجیب "ستم ظریفی" ہے کہ کسی ملک میں جب تک آزادی کا معرکہ درپیش رہتا ہے اور غیر ملکی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کیلئے ان عوام کی قربانیوں سرفروشی اور جوش و خروش کی ضرورت ہوتی ہے جو خدا کی رضا' اخروی اجر و ثواب اور اسلام کی سربلندی کے سوا کسی مقصد سے دلچسپی نہیں رکھتے' مذہب کی زبان کے سوا کسی زبان سے آشنا نہیں ہوتے اور مذہبی نعروں کے بغیر ان کے خون میں گرمی اور ان کے دماغوں میں نشہ پیدا نہیں کیا جا سکتا تو جنگ آزادی کے رہنما اس زبان کے سوا اپنے عوام سے کسی اور زبان میں گفتگو نہیں کرتے۔ وہ مذہبی نعروں ہی کے ذریعے اور اللہ کے نام کی بلندی' اسلام کی سربلندی اور اللہ کے احکام کے اجراء کا لالچ دے کر ان کو آگ سے کھیلنے اور خاک و خون میں لوٹنے کی دعوت دیتے ہیں اور اسی ایمانی طاقت سے (جس کے مقابلہ میں کم از کم مسلمان عوام میں کوئی طاقت نہیں پائی جاتی) آزادی کا قلعہ فتح کرتے ہیں اور

ناقابل تسخیر دشمن کو سرنگوں ہونے پر مجبور کرتے ہیں لیکن
جیسے ہی یہ ناگزیر منزل طے ہوتی ہے اور ملک کا اقتدار اعلیٰ اور
ان سیاسی رہنماؤں کی زبان میں "ملک وقوم کی قسمت" ان کے
ہاتھ میں آجاتی ہے وہ ملک کو مغربیت اور نا مذہبیت
(سیکولرازم) کے راستہ پر ڈال دیتے ہیں اور جلد سے جلد
مذہب اور معاشرہ کی اصلاح' اسلامی قانون (پرسنل لاء) کی
تنسیخ وترمیم اور ملک کو مغرب کے سانچے میں ڈھالنے کا
(ضروری) کام شروع کر دیتے ہیں اور اس میں اتنی شدت
اور عجلت سے کام لیتے ہیں کہ بعض اوقات وہ لوگ جنہوں نے
بے دریغ قربانیاں دی تھیں یہ سوچنے لگتے ہیں کہ انہوں نے
شاید غلطی کی اور ملک کی آزادی' اسلامی زندگی اور مذہبی
آزادی کے حق میں مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوئی۔
۱۹۲۴ء کے ترکی سے لے کر ۱۹۶۲ء کے الجزائر تک یہ ایک
مسلسل داستان ہے جس میں کوئی استثناء نظر نہیں آتا۔"
(مسلم ممالک میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش ص۲۰۱)

احقر کو معلوم نہیں کہ ایسی صورت حال کی وجہ سے کبھی کسی نے ان ممالک کی آزادی ہی کو غلط قرار دیا ہو' پاکستان کو بھی کم از کم اسی طرح کا ایک مسلمان ملک سمجھ کر اس کے استقلال اور حصول کو درست فیصلہ تسلیم کر لیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس پر کوئی صاحب یہ وجہ فرق بیان فرمائیں کہ دراصل پاکستان کا قیام انگریز کی ایک سازش تھی جس کا مقصد برصغیر کے ان دو ملکوں کو آپس میں لڑا کر خطے میں عدم استحکام پیدا کرنا اور سامراجی عزائم کو تحفظ دینا تھا۔ کانگریس متحدہ قومیت کے ذریعے ہندوستان کو متحد رکھ کر انگریز سامراج کے انہی عزائم کے راستہ میں رکاوٹ بننا چاہتی تھی لیکن آزادی کے بعد کی چھیالیس سالہ تاریخ واضح طور پر بتا

رہی ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعات کا سبب کس کی ہٹ دھرمی بنی ہے۔ یہ عجیب منطق سمجھ سے بالاتر ہے کہ تمام معاملات میں ضد' ہٹ دھرمی اور فساد کی جڑ ہونے کا ثبوت تو ہندوستان بالخصوص وہاں کی کانگریسی حکومت دے لیکن ان تنازعات کی وجہ سے سامراجی ایجنٹ ہونے کا خطاب پاکستان کو ملے۔

پھر پاکستان کی موجودہ دینی صورت حال پر غور کرتے وقت عموماً دو اصولی غلطیاں ہو جاتی ہیں ایک یہ کہ موجودہ پاکستان کا تقابل قرون اولیٰ کی اسلامی سلطنتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے تو مایوسی ہی ہو گی۔ اصل طریقہ یہ ہے کہ اس کا تقابل ایک طرف تو کانگریس کی طرف سے مجوزہ متحدہ ہندوستان سے کیا جائے کہ اگر اس تجویز پر عمل ہو جاتا ہے تو اسلامی دستور و قوانین کے حوالے سے کیا صورت حال ہوتی اور اب کیا ہے۔ دوسرے اس کا تقابل اس دور کے اسلامی ممالک' ان کے دساتیر اور قوانین وغیرہ سے کیا جائے۔ یقیناً اس زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو بہت زیادہ مایوسی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس لئے کہ متحدہ ہندوستان کی صورت میں زیادہ سے زیادہ جو چیز حاصل کی جا سکتی تھی وہ صوبائی خود مختاری تھی تاکہ مسلم اکثریت کے صوبے اکثر امور میں اپنی مرضی سے قانون سازی کر سکیں' لیکن صوبائی خود مختاری مکمل استقلال اور داخلی و خارجی مکمل اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) جو ایک ملک کو حاصل ہوتا ہے' سے بہر حال کم درجے کی چیز ہے۔ ؎ کسی نظریے کی تطبیق اور بالخصوص بین الاقوامی کردار کی توقع

؎ پھر یہ خطرہ بھی محسوس کیا جا رہا تھا صوبوں کی حد بندی میں تبدیلی یا انتقال آبادی کے ذریعے مسلم اکثریت کے علاقوں کو مسلم اقلیت والے علاقوں میں تبدیل کر دیا جائے' اس طرح صوبائی خود مختاری سے مسلمان جو تھوڑا بہت فائدہ اٹھا سکتے تھے اس میں بھی رکاوٹیں ڈال دی جائیں اور یہ خطرے بے بنیاد بھی نہیں تھے۔ (تحریک پاکستان' تاریخی خدوخال ص ۱۵۹'۱۷۲)

ظاہر ہے کہ جو مکمل استقلال سے کی جاسکتی ہے وہ محض صوبائی خود مختاری سے نہیں کی جاسکتی۔ رہی بات ان لوگوں کی جو پاکستان بننے کی صورت میں نفاذ اسلامی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں تو ایسے لوگوں کی خود کانگریس کے حامی مسلمانوں میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ ایسے لوگوں کی واضح یادگار اے این پی کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ مسلم اکثریتی علاقوں (موجودہ پاکستان) کی سیاست پر حاوی جاگیرداروں، وڈیروں اور سرداروں نے جیسے پہلے اپنی وفاداریاں انگریزوں کو بیچ رکھی تھیں اب یہ کانگریس کے ہندو عنصر کو بیچ کر صوبائی خود مختاری کو دینی مقاصد کے لئے استعمال میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔

حاصل یہ کہ موجودہ صورت حال کا تقابل کانگریس کی مجوزہ صورت حال سے کیا جائے تو موجودہ صورت حال اپنی تمام خامیوں کے باوجود اس مجوزہ صورت حال سے بہتر ہے۔ اسی طرح پاکستان کا تقابل اگر اس وقت کے دوسرے اسلامی ممالک سے کیا جائے تو اکثر کے مقابلے میں یہ ملک انتہائی غنیمت نظر آئے گا۔ یہ صحیح ہے کہ جس منزل کے حصول کے لئے یہ ملک حاصل کیا گیا تھا اس سے ہم ابھی بہت پیچھے ہیں لیکن پھر بھی یہاں کے آئین، قوانین اور دوسرے شعبوں میں بہت سی ایسی خصوصیات اور خوبیاں موجود ہیں جو بہت سے اسلامی ملکوں میں نہیں ہیں یا کم از کم متحدہ ہندوستان کی صورت میں حاصل نہیں کی جاسکتی تھیں۔

دوسری غلطی اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے یہ ہوتی ہے کہ یہاں کی خامیوں کا تذکرہ کچھ زیادہ مبالغے کے ساتھ ایسے مایوس کن انداز سے کیا جاتا ہے کہ خوبیوں کی طرف نظر ہی کم جاتی ہے۔ گو اس انداز کا منشا بھی اخلاص اور دینی تڑپ ہی ہو لیکن یہ انداز فکر و گفتگو صحیح نتائج تک پہنچنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی دامت برکاتہم ماہنامہ "بینات" ذوالحجہ ۱۴۱۳ھ کے اداریے میں فرماتے ہیں:

"قریباً نصف صدی گزرنے پر بھی پاکستان اسلامی قوانین کے معاملے میں اسی مقام پر کھڑا ہے جہاں تقسیم کے وقت تھا بلکہ اس سے بھی چند قدم پیچھے۔"

(ص ۱۴)

لیکن اگر قیام پاکستان کے وقت کی آئینی و قانونی صورت حال اور موجودہ صورت حال کا تقابل کیا جائے تو اس رائے سے اتفاق کرنا انتہائی مشکل نظر آئے گا۔ آزادی سے پہلے پورے ہندوستان میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء رائج تھا۔ آزادی کے وقت دونوں ملکوں کو یہی ایکٹ بطور دستوری اساس ورثے میں ملا تھا۔ چنانچہ پاکستان میں بھی نئے دستور کی تشکیل تک اسی ایکٹ میں مناسب ترمیمات کر کے حکومت چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ص ۱۳۸/ ج ۱۶ مقالہ "قانون اساسی") یہ تھی اس وقت کی آئینی صورت حال، پھر آئین سازی کا کام انتہائی صبر آزما قسم کے حالات سے گزرتا رہا۔ مختلف دستور بنتے اور منسوخ ہوتے رہے تا آنکہ ۱۹۷۳ء کا دستور متفقہ طور پر منظور ہوا۔ اب یہی دستور بہت سی ترمیمات کے ساتھ نافذ العمل ہے۔ موجودہ آئین کو مثالی اسلامی آئین نہیں کہا جاسکتا، اس میں دینی نقطہ نظر سے بہت سے سقم موجود ہیں لیکن ابتدائی صورت حال اور موجودہ دستور میں اگر تقابل کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا[1] اور اتنی بات واضح ہو جائے گی کہ اس شعبے میں گو ہم منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکے لیکن کچھ نہ کچھ

---

[1] خود حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ نے اپنی ایک تقریر میں اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ دستور میں کوئی ایسی خرابی نہیں جو اسلام کے منافی ہو۔ ضرورت دستور کو چلانے والے کی ہے جو متدین اور قوی ایمان والا ہو۔ (ملاحظہ ہو خطبات ختم نبوت ج ۱ ص ۳۰۳ از مولانا محمد اسماعیل شجاع آبادی)

قدم آگے ضرور بڑھے ہیں' قدم پیچھے ہٹنے والی بات درست نہیں۔

نہ صرف یہ کہ موجودہ آئینی صورت ابتدائی صورت سے بہتر ہے بلکہ اس میں بہت سی ایسی خوبیاں بھی موجود ہیں جو بہت کم اسلامی ممالک کے دساتیر میں نظر آئیں گی' مثلاً قراردادِ مقاصد (جو پہلے تمام دستوروں میں بطور تمہید (Preamble) کے شامل رہی ہے اور اب دفعہ ۲الف کے طور پر دستور کا نافذ العمل حصہ ہے) میں یہ اصول تسلیم کیا گیا ہے کہ اصل حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور جمہور پاکستان کو جو اختیار و اقتدار اس کی مقرر کردہ حدود میں استعمال کرنے کا حق ہوگا وہ ایک مقدس امانت ہے۔ قراردادِ مقاصد کے آئین کا باقاعدہ حصہ بن جانے پر جن عملی ثمرات کے مرتب ہونے کی بظاہر توقع کی جاسکتی تھی وہ مرتب نہیں ہوئے ؎ لیکن دستور میں اس کا وجود اس بات کی یاددہانی ضرور کراتا رہے گا کہ یہ ملک اسلام کے نام پر ہی حاصل کیا گیا ہے اور نفاذِ اسلام ہی اس کی منزل مقصود ہے۔ چنانچہ اس قرارداد نے ملک کو کھلے سیکولرازم کی طرف لے جانے کی کوشش کے خلاف مضبوط حصار کا کام دیا ہے۔ قراردادِ مقاصد کے علاوہ حکمت عملی کے اصول والے باب کی بہت سی دفعات' دفعہ ۶۲ (جس میں رکنیت مجلس شوریٰ یعنی پارلیمنٹ کے لئے شرائط اہلیت کا تعین کیا گیا ہے)' دستور کا حصہ نہم (جو اسلامی احکام ہی کے عنوان سے ہے اور اس میں اسلامی نظریاتی کونسل وغیرہ کے بارے میں دفعات ہیں)' جدول سوم کے بیشتر حلف نامے جن کے مطابق صدر' وزیراعظم' وزراء اعلیٰ' مرکزی و صوبائی وزراء' اراکین اسمبلی وغیرہ کو اس بات کا بھی حلف اٹھانا ہوتا ہے کہ "میں اسلامی نظریہ کو برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہوں گا جو کہ قیام

؎ بعض ہائی کورٹس نے دستور کی بعض دفعات کو خلاف اسلام ہونے کی وجہ سے کالعدم بھی قرار دے دیا تھا لیکن سپریم کورٹ کے ایک فیصلے نے ان اثرات کو زائل کر دیا۔

پاکستان کی بنیاد ہے"۔ اس قسم کی دفعات کے بظاہر خاص عملی نتائج ظاہر نہیں ہوتے لیکن ان کا ہونا نہ ہونے سے بہرحال بہتر ہے' ان کے ہوتے ہوئے کسی کے لئے ملک کو کھلم کھلی لادینیت (سیکولرازم) اور نفاذِ اسلام سے صریح انکار کی طرف لے جانا انتہائی مشکل ہوگا۔

دستور پاکستان کی اہم ترین خصوصیت جس کی نظیر شاید کسی اور دستور میں نہ مل سکے وہ اس کے حصہ ہفتم کا باب ۳الف ہے جو آٹھویں ترمیم کے ذریعے دستور میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق ملک میں وفاقی شرعی عدالت قائم ہے جو عام جج حضرات اور علماء پر مشتمل ہوتی ہے۔ پاکستان کے کسی بھی شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ چند ایک مستثنیات کے علاوہ کسی بھی ملکی یا صوبائی قانون کو قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بنیاد پر چیلنج کرے' اگر عدالت اس قانون کو واقعی قرآن و سنت کے خلاف پائے تو وہ حکومت کو متعینہ تاریخ تک قانون تبدیل کرنے کا حکم دیتی ہے' اگر حکومت مناسب تبدیلی نہ کرے تو سابقہ قانون خودبخود ختم ہو جاتا ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں کے خلاف اپیل کے لئے سپریم کورٹ میں شریعت اپیلیٹ بنچ قائم کیا گیا ہے جو سپریم کورٹ کے تین جج صاحبان اور دو علماء پر مشتمل ہوتا ہے اگر یہ بنچ بھی کسی قانون کو قرآن و سنت کے خلاف قرار دے دے تو حکومت کے لئے قانون کو تبدیل یا ختم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔

یہ عدالت اب تک بہت سے قوانین پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور کر چکی ہے اور اس کے احکامات کی وجہ سے بہت سے خلاف اسلام قوانین ختم یا تبدیل ہو چکے ہیں جن میں قانون شفعہ' مجموعہ تعزیرات پاکستان کی وہ دفعات جن کا قصاص و دیات سے تعلق تھا اور قانون توہین رسالتؐ وغیرہ شامل ہیں۔ سود کے بارے میں بھی وفاقی شرعی عدالت اپنا فیصلہ دے چکی ہے اور اپیل شریعت اپیلیٹ بنچ میں زیر غور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عدالت انتہائی مفید اور کارآمد سلسلہ تھا لیکن اس کی اہمیت و

افادیت اور نزاکت کا نفاذ اسلام کے داعی اور اس کے لئے محنت کرنے والے حلقوں نے صحیح اندازہ نہیں لگایا' اس سلسلے میں بڑی غلطیاں دو ہوئیں ایک تو یہ کہ قوانین کی تبدیلی کے سلسلے میں اس عدالت سے جو فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا وہ نہیں اٹھایا گیا۔ اس معاملے میں یہ عدالت قومی اور صوبائی اسمبلیوں سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ اس کے ذریعے سے اکثر خلافِ شرع قوانین کو تبدیل کرانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اس عدالت کے نظام میں بعض سقم بھی موجود ہیں۔ سب سے اہم سقم یہ ہے کہ بعض معاملات (یعنی دستور اور مسلم پرسنل لاز) اس عدالت کے دائرہ اختیار سے خارج ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان خامیوں کے بارے میں رائے عامہ کو ہموار کیا جاتا اور ان کے ازالے کے لئے مؤثر آواز اٹھائی جاتی بالخصوص اس کے دائرہ اختیار میں توسیع کا مطالبہ کیا جاتا لیکن اس کی طرف بھی کماحقہ توجہ نہیں دی گئی۔

حاصل یہ کہ وفاقی شرعی عدالت کا یہ سلسلہ ہمارے دستور کی ایک اہم خصوصیت ہے جس کی رو سے گویا (چند مستثنیات کے علاوہ) قرآن و سنت کی بالادستی کو عملاً تسلیم کرتے ہوئے اس کا طریقہ کار وضع کر دیا گیا ہے۔ باقی اسلامی دفعات کے محض نصیحت ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دستور میں ان کے عملی نفاذ کا طریقہ متعین نہیں اور نہ ہی اس مقصد کے لئے کوئی قانون سازی کی گئی۔

یہ تو آئین کے متعلق صورت حال تھی۔ دوسرے قوانین میں بھی کافی تعداد خلاف شریعت قوانین کی ہے۔ لیکن الحمد للہ بہت سے صحیح قوانین بھی اس وقت موجود ہیں۔ بعض قوانین تو ابتداءً شریعت سے متصادم تھے ہی نہیں۔ بہت سے خلاف شریعت قوانین منسوخ یا تبدیل ہو چکے ہیں اور بعض نئے اسلامی قوانین بھی اس وقت نافذ ہیں۔ مثلاً شرعی حدود اس وقت قانوناً نافذ ہیں۔ بعض حضرات کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ان حدود کے اصل اسلامی ثمرات تو ظاہر نہیں ہو رہے' یہ واقعی

ایک ناپسندیدہ پہلو ہے لیکن اس کے باوجود حدود کا بطور قانون موجود ہونا یہ ایک مستقل مقصد ہے۔ حدود کے عدم نفاذ کی صورت میں ہمارا قانون شریعت اسلامیہ کا باغی تھا اب اس حد تک بغاوت ختم ہو گئی ہے' یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ قادیانیوں کی خلافِ اسلام سرگرمیوں پر پابندی کا قانون موجود ہے اور اب سپریم کورٹ اس قانون کو انسانی حقوق کے خلاف قرار دینے کی درخواست بھی مسترد کر چکی ہے۔ اس سے پہلے وفاقی شرعی عدالت بھی اسے کتاب و سنت کے خلاف قرار دینے کی درخواست مسترد کر چکی ہے۔ اس قانون کی وجہ سے پوری دنیا میں پاکستان اور حکومت پاکستان کے خلاف بہت زبردست پروپیگنڈہ بھی کیا گیا تھا اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں حکومت پاکستان پر بیرونی دباؤ بھی پڑا ہو لیکن اس کے باوجود الحمد للہ یہ قانون موجود ہے۔ قصاص و دیت کا قانون بھی اس وقت نافذ ہے۔ اس میں موجود خامیوں کی اصلاح کے لئے وفاقی شرعی عدالت میں درخواست دینے کا راستہ کھلا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی پہلے بھی قابل تعزیر جرم تھی لیکن محض اس حیثیت سے کہ اس سے مذہبی دل آزاری ہوتی ہے لیکن اب اس کی باقاعدہ شرعی سزا نافذ ہے۔ اسی طرح خلفاء راشدین' ازواج مطہرات و صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں توہین پر سزا کی مستقل دفعہ موجود ہے۔ اسی طرح ۱۸۷۲ء کے قانون شہادت کی جگہ اب ۱۹۸۴ء کا قانون شہادت لے چکا ہے جس کا مقصد قانون شہادت کو اسلام کے مطابق بنانا ہے۔ گویا نئے قانون شہادت نے ایک سو بارہ سالہ فرسودہ انگریزی قانون کی جگہ لے لی ہے۔ یہ چند مثالیں ہیں جو یہ اندازہ لگانے کے لئے کافی ہیں کہ گو نفاذ اسلام کی منزل پورے طور پر حاصل نہیں کی جا سکی لیکن اس جانب کچھ قدم بہر حال ضرور اٹھے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں کہ "پاکستان اسلامی قوانین کے معاملے میں اسی مقام پر کھڑا ہے جہاں تقسیم کے وقت تھا بلکہ اس سے بھی چند قدم پیچھے"۔

یہ تو چند آئینی اور قانونی نوعیت کی خصوصیات تھیں' اس کے علاوہ اسلامی نقطۂ نظر سے اور بھی بہت سی خوبیاں بحمدہ تعالیٰ موجود ہیں۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

"الغرض تقسیم کے بعد یہ خطرہ حقیقت بن کر سامنے آیا اس خطہ پاک میں دین اور دینی شعائر کی قدر و منزلت رفتہ رفتہ مٹتی چلی گئی۔"

(بینات ذوالحجہ: ۱۴۱۳ھ ص ۱۲)

واقعی ہمارے ملک میں سرکاری وغیر سرکاری سطح پر شعائر دین کے بارے میں انتہائی افسوسناک قسم کی غلطیاں اور خامیاں بھی سامنے آتی رہتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی ملک ہونے کے ناطے شعائر دین کے احترام کے سلسلے میں بہت سے اقدامات موجود ہیں انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مختلف مواقع پر بالخصوص یوم آزادی کے موقع پر یہ بات دہرائی جاتی ہے کہ پاکستان کا مطلب ہی لا الہ الا اللہ ہے' ہر سال احترام رمضان کے سلسلے میں باقاعدہ آرڈیننس نافذ کیا جاتا ہے' عموماً ہر بڑی سرکاری عمارت کے نقشے میں مسجد کو شامل کیا جاتا ہے۔ پارلیمنٹ ہاؤس اور دوسری اہم عمارتوں پر کلمہ طیبہ اور دوسری قرآنی آیات لکھی ہوئی ملیں گی۔ وفاقی محتسب کے فیصلے کے مطابق تمام سکولوں میں ناظرہ قرآن کریم لازمی ہے' اسمبلی وغیرہ کے اجلاسات تلاوت قرآن کریم سے شروع کئے جاتے ہیں جبکہ تقسیم سے قبل کانگریس کے زیر اقتدار صوبوں میں صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس "بندے ماترم" کے ترانے سے شروع ہوتے تھے (دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲۱ / ص ۸۹) اب صدر اور وزیراعظم کی تقریر سے پہلے تلاوت کرانا بھی ان کی مجبوری بن چکا ہے' اسمبلی کے اجلاسوں کے دوران نمازوں کے لئے وقفہ ہوتا ہے۔ ایک پاکستانی صدر نے اقوام متحدہ کے جنرل اسمبلی کے ہال میں قرآن کریم کی

تلاوت کرائی' پاکستانی سائنس دانوں نے سب سے پہلے انٹارکٹیکا میں اذان کی آواز بلند کی' ٹیلیفون کے کمپیوٹرائزڈ نظاموں میں کسی بات کی اطلاع دینے سے قبل "السلام علیکم" کہا جاتا ہے' آپ کسی بھی فوجی علاقے میں چلے جائیں آپ کو "ایمان تقویٰ' جہاد فی سبیل اللہ" کا شعار جگہ جگہ لکھا ہوا نظر آئے گا۔ یہ چند مثالیں برجستہ ذہن میں آ گئی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ محض ان باتوں سے اسلام مکمل نافذ نہیں ہو جائے گا' لیکن بہر حال دینی شعائر کی تعظیم واحترام کی یہ چند مثالیں اور مسلمان ملک ہونے کے اچھے ثمرات ضرور ہیں۔

حمایت پاکستان کے اسباب و محرکات بیان کرتے ہوئے یہ عرض کیا گیا تھا کہ حضرت حکیم الامتؒ فریضہ جہاد کے احیاء کے لئے بے تاب تھے لیکن اس مقصد کے لئے مسلمانوں کی الگ حکومت کی ضرورت بھی محسوس فرما رہے تھے تاکہ وہ مسلمان ملک جہاد کے لئے مرکز کا کام دے' گویا جن خطوں کو آغاز جہاد کے لئے حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ نے منتخب فرمایا تھا حضرت تھانویؒ اسی علاقے میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے خواہاں تھے' الحمد للہ مسلمانوں میں اس فریضے کے احیاء کی ایک لہر پیدا ہو چکی ہے۔ مستقبل کا مؤرخ جب احیاء جہاد کی تاریخ لکھے گا تو وہ اس پاک سرزمین کو سرفہرست رکھنے پر مجبور ہوگا۔ جہاد افغانستان نے ایک سپر پاور کو صفر پاور بنا کر جو دنیا کے لئے انتہائی حیرت انگیز کارنامہ کر دکھایا اور اس مادی دور میں بھی ایمانی قوت کا لوہا منوالیا ہے' اس میں پاکستان کا سب سے زیادہ اور مرکزی حصہ ہے' پاکستان نہ ہوتا تو اسباب کے درجے میں اس قسم کی کامیابی کے امکانات نہیں تھے۔ ایران اور ترکی سے اس قسم کے کردار کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی جو پاکستان نے ادا کیا۔ جہاد پاکستان پوری دنیا میں احیاء جہاد کی بنیاد ثابت ہوا' اگر مجاہدین کا آپس کا افتراق نہ ہوتا اور ان میں اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ کی طرح رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کا وصف بھی موجود ہوتا تو اس سے بہتر نتائج و ثمرات ظاہر ہو سکتے تھے۔

صحیح اصولوں کے مطابق اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ جو قربانیاں دی جاتی ہیں اور جو جدوجہد کی جاتی ہے اس میں اگر ناکامی ہو بھی تو وہ محض وقتی وعارضی اور ظاہری ہوتی ہے' ایسی قربانیاں کبھی نہ کبھی ضرور رنگ لاتی ہیں۔ اسلام کے نام پر ایک ملک کا قیام اور پھر اس کا جہاد افغانستان کے لئے بیس کیمپ بنا' اس جہاد کی کامیابی اور اس پر مرتب ہونے والے اچھے ثمرات' یہ سب چیزیں درحقیقت حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ اور ان کے رفقاء کی قربانیوں کا ثمر ہیں۔ ؎ ان تمام محاسن سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تب بھی مسلمانوں کے لئے اسلام کے نام پر الگ مملکت کا حصول جس میں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کے پاس ہو بذات خود ایک مقصد ہے اور اس میں مکمل طور پر نفاذ اسلام یہ اس پر متفرع ہونے والا دوسرا مقصود ہے۔ اس کے عدم حصول کی وجہ سے پہلے امر کا حسن قبح سے تبدیل نہیں ہو جائے گا جیسا کہ ایک شخص مسلمان ہوتا ہے تو اس کے اسلام قبول کرتے وقت اس کے اخلاق واعمال اور کردار میں نمایاں اچھی تبدیلی کی توقع کی جاسکتی ہے لیکن بالفرض اگر وہ اس توقع پر پورا نہ اترے بلکہ اس کی عملی زندگی پہلے سے بھی زیادہ بگڑ جائے تو اس کے عملی بگاڑ پر اسے ملامت تو کی جائے گی کہ اس نے اسلام لانے کے تقاضے پورے نہیں کئے' لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کو مسلمان ہی نہ ہونا چاہئے تھا۔ کوئی شخص اگر پہلے سے اندازہ لگالے کہ یہ شخص مسلمان ہونے کے بعد عملی طور پر اور زیادہ بگڑ جائے گا تو اس کی

؎ ان امور کے علاوہ پاکستان کے کامیاب ایٹمی تجربات اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔ ان ایٹمی دھماکوں سے مسلمانوں پر صدیوں سے عائد فرض کی تکمیل کی طرف اہم پیش رفت ہوئی ہے' ایک طویل عرصے سے دفاعی پیداوار اور ٹیکنالوجی بالخصوص حساس ٹیکنالوجی پر مغرب کی اجارہ داری قائم رہی ہے جسے پاکستان کے ایٹمی تجربات نے کافی حد تک ختم کر دیا ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ جو کام دولتمند مسلمان ملکوں کو انجام دینا چاہئے تھا وہ ایک غریب اور سازشوں میں گھرے ہوئے ملک میں پوری دنیا کی مخالفت کے باوجود انجام پا گیا۔)

اس فراست کی داد تو دی جاسکتی ہے لیکن کسی کی اس بنیاد پر یہ رائے قبول نہیں کی جاسکتی کہ اس کو مسلمان ہی نہ ہونے دیا جائے' اس لئے کہ مسلمان ہونا بذات خود ایک مقصود ہے' دوسرے مقصد کے عدم حصول کی وجہ سے اس کی مقصودیت ختم نہیں ہو جائے گی۔

پھر اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس ملک میں جو دینی مفاسد موجود ہیں اور اسے مکمل طور پر اسلامی مملکت بنانے کی منزل جو دور ہوتی نظر آرہی ہے کیا اس کا سبب محض تقسیم ہند اور مذہب کے نام پر الگ مملکت کا حصول ہے یا اس کے اسباب کچھ اور ہیں۔ احقر کو تو کافی غور کے باوجود دین کے نام پر الگ مملکت کے حصول اور عدم نفاذ اسلام کے درمیان کوئی دور کا بھی علاقہ تسبب نظر نہیں آتا اور نہ ہی کوئی اس بات کا بظاہر قائل ہو سکتا ہے کہ اسلام کے نام پر الگ ملک کا حصول ہی عدم نفاذ اسلام کا سبب بنا ہے۔ یقیناً اس کے اسباب دوسرے ہوں گے اس لئے ان اسباب پر غور وفکر تو ضرور ہونا چاہئے لیکن اس کا تعلق حصول وعدم حصول پاکستان سے جوڑنا یا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ قیام پاکستان کا فیصلہ ہی بذات خود غلط تھا اور ہندوستان کو متحد رکھنا ہی ضروری تھا کسی طرح بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔

اس ملک میں عدم نفاذ اسلام کا ایک سبب یہ ہے کہ تحریک پاکستان میں جو زعماء پیش پیش تھے ان کی اکثریت خود اس سلسلے میں مخلص نہیں تھی یا کم از کم اس معاملے میں ان کے ذہن بہت سی الجھنوں کا شکار تھے لیکن اس مسئلے کا حل حصول پاکستان کی مخالفت کی بجائے اس میدان میں صحیح لوگوں بالخصوص ان حضرات کا آنا تھا جن کا انگریز کے خلاف جدوجہد کی وجہ سے عوام میں ایک خاص مقام بنا ہوا تھا۔

احقر کی نظر میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ برصغیر میں اسلامی ریاست کی آواز ایک طویل عرصے کے خلاء کے بعد اٹھی تھی' اس سے کافی پہلے اسلام کو عملی طور پر سیاست اور امور ریاست سے تقریباً پوری دنیا میں جدا کیا جا چکا تھا۔ دین و

ریاست کی اس جدائی اور تحریک پاکستان کے درمیانی عرصہ میں حالات اور لوگوں کے ذہنوں میں بڑی تبدیلی آچکی تھی' ایسی صورت میں اسلامی ریاست کے خدوخال اور اس دور میں اسلامی احکام کی تطبیق کی شکلوں کا واضح ہو جانا مناسب تھا' خاص طور پر جو لوگ کاروبار مملکت کے مختلف شعبوں کو سنبھالنے والے تھے انہیں پہلے معلوم ہوتا کہ نئی اسلامی مملکت میں ہمیں اپنے اندر اور اپنے طریقہ کار میں کیا تبدیلی لانا ہو گی؟ اگر کسی کے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی گنجلک تھی تو وہ دور ہو جانی چاہئے تھی۔

اکابر کی بعض عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض شخصیات کی اس طرف توجہ بھی تھی۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ کو جو حمایت مسلم لیگ کے ساتھ اس کی اصلاح کی فکر تھی وہ بھی اسی احساس کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں ہی' جب کہ ابھی قرارداد لاہور بھی پاس نہیں ہوئی تھی' آپ نے حضرت مولانا شبیر علی تھانوی رحمہ اللہ سے فرمایا تھا:

"میاں شبیر علی! ہوا کا رخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جاویں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی جن کو آج سب فاسق و فاجر کہتے ہیں' مولویوں کو تو ملنے سے رہی' لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنا چاہئے کہ یہی لوگ دیندار ہو جائیں۔"

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص ۵۵)

اسی طرح حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے دسمبر ۱۹۴۵ء کو مسلم لیگ کی ایک کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"پاکستان حاصل ہونے تک کا یہ درمیانی زمانہ ہماری سخت آزمائش کا زمانہ ہے ہم کو پاکستان کے بعد کے لئے قرآنی تعلیم و تربیت کا درس ابھی سے حاصل کرنا ہے۔ آپ کو

معلوم ہے کہ قرآن کریم نے تمکین فی الارض یعنی اسلامی حکومت کی کیا غرض و غایت بتائی ہے؟ الخ۔"

(بینات محرم ۱۴۱۴ھ ص ۴)

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اس ضرورت کا احساس تو موجود تھا لیکن سیاسی افراتفری اور وقت کی قلت نے اس پر بھرپور توجہ دینے کا موقع نہیں دیا بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ متبحر اور محقق علماء کو بھی آخر میں سیاست کے عملی میدان میں کودنا پڑا اور مسلمانوں بالخصوص اہل علم و اہل دین کی توانائیوں کا ایک بڑا حصہ اسی بحث میں صرف ہو گیا کہ وطنی متحدہ قومیت کی داعی کانگریس کا ساتھ دیا جائے یا مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کے حصول کے لئے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حصول پاکستان کے بعد دینی جدوجہد کا ہمیں ایک نیا میدان ملا اور دینی و لادینی قوتوں کے درمیان ایک نیا محاذ کھلا ہے۔ ہماری دینی سیاسی جماعتوں نے اس محاذ پر کام کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج ہماری سیاست میں کسی قدر دین کا نام موجود ہے تو اس میں ان جماعتوں کے کردار کا بہت بڑا حصہ ہے' ان کے بہت سے کمزور پہلوؤں کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ:

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے

لیکن ان جماعتوں کے مقاصد کے حصول کے لئے جس قسم کی یکجہتی' منصوبہ بندی' موقع شناسی اور رجال سازی وغیرہ کی ضرورت تھی اس میں بہت حد تک کوتاہی ہوئی ہے۔ ملکی سیاست کے اہم اور نازک موڑوں پر محتاط اور مؤثر حکمت عملی اختیار کرنا تو دور کی بات ہے عموماً ایسے مواقع پر دینی قوتیں آپس کے انتشار و افتراق کا شکار رہی ہیں۔ جہاں کہیں کسی شعبے میں نفاذ دین کے کچھ مواقع پیدا ہوئے ان سے صحیح استفادہ نہیں کیا گیا' رجال سازی تو شاید ان جماعتوں کے پروگرام کا

حصہ ہی نہ ہو۔ حاصل یہ کہ نفاذ اسلام کی منزل دور ہونے میں ہماری دینی قوتوں کی بہت سی کمزوریوں اور خامیوں کا دخل ہے [1] ان کوتاہیوں کی ذمہ داری بھی محرکین پاکستان پر عائد کرتے ہوئے یہ کہنا کہ اس اسلامی مملکت کا وجود میں آنا ہی ساری خرابیوں کا سبب ہے' یہ تسلیم حقائق سے بہت بڑا افرار ہے۔

---

[1] کسی قدر تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ضمیمہ میں دیا گیا مضمون: "دینی سیاسی جماعتوں کی خدمت میں"۔

اب کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے؟

اصل قابل غور بات یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اس موضوع پر کیا انداز اختیار کرنا زیادہ موزوں اور مناسب ہے' اسی مقصد کے لئے دراصل اس موضوع پر گفتگو شروع کی گئی تھی جو اندازے سے کہیں لمبی ہوگئی' اس سلسلے میں اس ناچیز کے ذہن میں جو تجاویز ہیں وہ چند نمبروں میں پیش کی جاتی ہیں:

(۱)۔۔۔۔ ہمارے وہ اکابر رحمہم اللہ جنہوں نے پاکستان کے مسئلے پر مسلم لیگ کی حمایت نہیں کی تھی ان کی سیاسی جدوجہد کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ان کی محنتوں کا وہ ہے جو انہوں نے برصغیر سے انگریزی اقتدار اور تسلط کے خاتمے کے لئے کی ہیں' اس مقصد کے لئے ان حضرات نے جو قربانیاں دیں اور اولوالعزمی' استقلال اور پامردی کی جو شاندار مثالیں قائم کیں وہ ہماری تاریخ کا انتہائی تابناک حصہ ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے بعد مجاہدین کے ساتھ جو ظلم و ستم روا رکھا گیا اس کے پیش نظر آزادی کا نام لینا بھی مصائب کے ایک غیر متناہی سلسلے کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ان حالات میں آزادی کے لئے آواز بلند کرنا اور اس کے لئے جدوجہد کرنا انہی حضرات کا حصہ تھا اور یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ مسلم لیگی رہنماؤں کی اکثریت ایسے حضرات کی تھی جن کا انگریز کے خلاف اس جدوجہد اور انگریزی اقتدار سے عوام کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے میں کوئی خاص کردار نہیں تھا۔

ان اکابر کی سیاسی زندگی کا دوسرا دور وہ ہے جس میں انہوں نے انگریز کے خلاف جدوجہد کے ساتھ اپنی دیانت دارانہ رائے کے مطابق مسلمانوں کی خیر خواہی کے جذبے سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلمانان برصغیر کا مفاد متحدہ ہندوستان میں ہے اور تقسیم ہند کے نتائج ان کے لئے اچھے نہیں ہوں گے۔

اس سلسلے میں انہوں نے بعض ایسے خدشات کا اظہار بھی کیا جو بعد میں واقعہ بن کر سامنے آئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان اکابر کی سیاسی زندگی کے پہلے حصہ کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی جائے اور ان کی عظمت کا راز مخالفت پاکستان میں ڈھونڈنے اور ان کا تعارف پاکستان میں پائی جانے والی خامیوں کے حوالے سے کرانے کی بجائے انگریز کے خلاف ان کی جدوجہد کے حوالے سے ان کے سیاسی مقام وخدمات کو متعارف کرایا جائے اور نئی نسل کو یہ سمجھایا جائے کہ پاکستان انگریز کے ہندوستان سے نکل جانے ہی کی بدولت وجود میں آیا ہے اور انگریز کو ہندوستان چھوڑنے پر جہاں بین الاقوامی حالات نے مجبور کیا ہے وہیں اس میں اندرونی طور پر انگریزی اقتدار سے بیزاری اور آزادی کی خواہش کا بھی دخل تھا اور یہ چیز انہی حضرات کی محنتوں کی بدولت پیدا ہوئی تھی ورنہ شاید ایک طبقہ یہاں کے لوگوں کی ایسی ذہنیت بنا دیتا کہ انگریز یہاں سے رخصت بھی ہونا چاہتا تو لوگ اس کے بقاء کا مطالبہ کرتے' اس طرح سے پاکستان کی بنیادوں میں ان حضرات کی جدوجہد کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔

جہاں تک ان حضرات کی طرف سے مخالفت پاکستان کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں لوگوں کو یہی سمجھانا چاہئے کہ یہ ان حضرات کی ایک دیانت دارانہ رائے تھی' اس رائے کے صحیح یا غلط ہونے سے قطع نظر انہیں ایک رائے رکھنے اور اس کا اظہار کرنے کا پورا حق حاصل تھا' یہ حق استعمال کر کے ان حضرات نے کوئی جرم نہیں کیا اور نہ ہی اس کی وجہ سے ان کی باقی خدمات کو فراموش کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں تجربہ یہ ہے کہ حمایت پاکستان کے نظریہ کو درست تسلیم کر کے اگر یہ بات سمجھانے کی کوشش کی جائے تو عام لوگوں کو زیادہ آسانی سے سمجھ آجاتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد پیش آنے والے نتائج کو ان حضرات کی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کرنے کا منشا عموماً ان کی سیاسی عظمت کو ثابت کرنا ہوتا ہے'

لیکن اس کے لئے ان چیزوں کا سہارا لینے کی ضرورت تب ہوتی جب کہ ان کی سیاسی خدمات مخالفت پاکستان میں منحصر ہوتیں' حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ یہ پہلو ان کی سیاسی جدوجہد کا ایک انتہائی معمولی حصہ ہے۔

پھر اس پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ اگر پاکستان کی خامیوں' ناکامیوں اور کمزوریوں کو اپنے اکابر کی سیاسی عظمت اور فراست کی دلیل کے طور پر پیش کیا جائے گا تو اس سے بہت سے ناواقف لوگوں کے ذہنوں میں یہ تاثر ابھرے گا کہ شاید یہ لوگ ان خرابیوں کے ظہور کے منتظر رہتے ہیں تاکہ انہیں اپنی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ تاثر انتہائی خطرناک اور حقیقت حال سے انتہائی دور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کی محبت اور اس کی حفاظت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے جذبے میں دونوں طرف کے اکابر سے وابستگی اور مناسبت رکھنے والے حضرات کبھی کسی سے کم نہیں رہے' اس لئے ایسا انداز بھی اختیار نہیں کرنا چاہئے جس سے سب زیادہ محب ملک طبقہ کی محبت ذرا بھی مشکوک نظر آنے لگے۔

(۲)۔۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ علماء دیوبند کی ایک جماعت نے قیام پاکستان کی حمایت نہیں کی تھی لیکن پاکستان بن جانے کے بعد اس ملک کی حفاظت' ترقی اور اس میں نفاذ اسلام کے لئے محنت و کوشش تمام حضرات کا متفقہ نظریہ بن گیا تھا۔ خود شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ نے اس ملک کو مسجد کی طرح قرار دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ مسجد کے بننے سے پہلے تو اختلاف ہو سکتا ہے کہ بنے یا نہ بنے لیکن بن جانے کے بعد اس کا احترام اور حفاظت بہر حال مسلمان کا فریضہ ہے۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمہ اللہ کے اس سلسلے میں ارشادات تو بہت معروف ہیں' آپ نے قیام پاکستان کے بعد بہت سے عام خطابات میں لوگوں کے اندر اس ملک کی حفاظت کا جذبہ ابھارا۔ یہ ان حضرات کے اخلاص اور مسلمانوں کے ساتھ سچی

ہمدردی کی واضح دلیل ہے کہ اپنی رائے کے خلاف فیصلہ ہو جانے کے بعد اسے اپنی سیاسی انا کا مسئلہ بنانے کی بجائے مسلمانوں کو وہی مشورہ دیا جو ان نئے حالات میں ان کے لئے مفید تھا، بالخصوص ہندوستان میں بیٹھ کر پاکستان کو مسجد کے ساتھ تشبیہ دینا اور اس کی حفاظت و ترقی کو ضروری قرار دینا معمولی بات نہیں۔ احقر نے حضرت مولانا نجم الحسن تھانوی قدس سرہ سابق صدر مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان سے کئی مرتبہ سنا کہ سلہٹ ریفرنڈم کے موقع پر نہرو نے حضرت قدس سرہ سے پاکستان کے خلاف کام کرنے اور اپنے متعلقین کو انڈیا کی حمایت کا حکم دینے کی درخواست کی اس لئے کہ اس علاقے میں حضرتؒ کا حلقہ ارادت بہت پھیلا ہوا تھا اور آپ عموماً رمضان یہیں گزارتے تھے۔ آپؒ نے یہ درخواست قبول کرنے سے اس بنیاد پر انکار کر دیا کہ ایک اسلامی ریاست وجود میں آجانے کے بعد اس کے رقبے میں کمی کی کوشش کیسے کی جاسکتی ہے۔ واقعی علماء ربانی کی سیاست کا انداز یہی ہوتا ہے ورنہ بعض نرے سیاسی لیڈروں نے بھی پاکستان کی مخالفت اور صوبہ سرحد کو پاکستان سے الگ رکھنے کی کوشش کی اور آخر دم تک اپنی مخالفت پاکستان والی ضد پر کسی نہ کسی طرح ڈٹے رہے لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ حب وطن کے دعویدار ایک طبقے نے ان مخلص حضرات کے دیانت دارانہ اظہار رائے کو تو ابھی تک معاف نہیں کیا لیکن دوسری قسم کے مخالفین پاکستان کے ساتھ اتحاد و یکجہتی کی وجہ سے ان کے ہاں کسی حب وطن پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ [1] بہر حال قیام پاکستان کے بعد اس کی حمایت اور اس کی حفاظت کو ضروری قرار دینا ان اکابر کی سیاسی فکر کے تسلسل کا ایک اہم حصہ ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ان حضرات کے اس نوعیت کے اقوال

---

[1] یہ سطور اس دور کی لکھی ہوئی ہیں جب کہ اے این پی مسلم لیگ کی حلیف تھی اور مسلم لیگ اس کی ہر ناز برداری کے لئے تیار رہتی تھی۔

لوگوں کے سامنے لائے جائیں تاکہ ان حضرات کی مکمل سیاسی تصویر لوگوں کے سامنے آئے اور علماء ربانی اور عام لیڈروں کی سیاست میں فرق واضح ہو۔

(۳)۔۔۔۔ پاکستان بن جانے کے بعد بڑی ضرورت اس چیز کی تھی کہ نفاذ اسلام کے لئے اور اس راستے میں رکاوٹ بننے والوں سے مقابلے کے لئے مربوط اور منصوبہ بند محنت کی جاتی، لیکن افسوس ہے کہ یہ کام کما حقہ نہیں ہو سکا۔ آئندہ اس موضوع پر کام کے لئے ضروری ہو گا کہ نوجوانوں کی ذہنی و فکری تربیت کی جائے، انہیں یہ سمجھایا جائے کہ اس ملک کے حصول کا مقصد کیا تھا؟ اور جس منزل تک پہنچنے کے لئے یہ راستہ اختیار کیا گیا تھا وہ کتنی ہی دور سہی بہر حال ناممکن نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ہم اپنے نوجوانوں کو ساتھ ہی یہ بھی سمجھائیں کہ اس ملک کے حصول کی مخالفت کرنے والوں کا نظریہ بالکل درست تھا اس لئے نہ تو (خاکم بدہن) اس ملک کی بقاء کے امکانات ہیں اور نہ ہی اس میں نفاذ اسلام کے تو اس سے یہ عجیب قسم کے فکری تضاد کا شکار ہو جائیں گے اور انہیں نفاذ اسلام کی جدوجہد کے لئے ذہناً تیار کرنا انتہائی مشکل ہو جائے گا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ قیام پاکستان کے اصل محرکات سمجھائے جائیں اور اس کی دینی ضرورت واضح کی جائے۔

(۴)۔۔۔۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں علماء دیوبند کے کردار اور ان کی خدمات جن کا بیشتر حصہ لادین اور علماء دشمن طبقے کی سازشوں کی وجہ سے پردہ خفاء میں ہے عام لوگوں کو ان سے روشناس کرایا جائے تاکہ یہ تاثر ختم ہو کہ علماء دیوبند کے تمام طبقات نے قیام پاکستان کی مخالفت کی۔ نیز ان حضرات کے ذہنوں میں جو قیام پاکستان کے مقاصد تھے دراصل وہی اصل نظریہ پاکستان ہیں، انہیں اجاگر کیا جائے۔
قیام پاکستان سے پہلے کون سی رائے درست تھی اور کون سی غلط یہ ایک الگ بحث ہے۔ اتنی بات تو واضح ہی ہے کہ اب پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک حقیقت بن کر موجود ہے۔ اس ملک کے وجود میں آنے کے بعد یہاں کے تمام شعبوں میں بالعموم

اور سیاست میں بالخصوص صحیح دینی فکر کی ترویج' پاکستان کی حمایت کرنے والے اکابر کا دامن تھامے بغیر اور ان کی خدمات متعارف کرائے بغیر بظاہر ممکن نہیں ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان ایک فراڈ تھا یا ضرورت تھی' اس پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ پاکستان بن جانے کے بعد یہاں کئی مرتبہ مسلم لیگ کو اقتدار سے متمتع ہونے کا موقع ملا ہے' یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ یہ اپنے دور اقتدار میں نفاذ اسلام کی طرف واضح پیش رفت کر کے عملی طور پر ان تمام اشکالات واعتراضات کا جواب دے دیتی اور یہ ثابت کر دیتی کہ ان حضرات نے پاکستان میں جن حالات کی پیش گوئی کی تھی وہ غلط تھی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور مقاصد پاکستان کے سلسلے میں مجرمانہ قسم کی کوتاہی برتی گئی جس کی وجہ سے ہمارا بازو کٹ کر الگ ہو گیا اور باقی ماندہ ملک میں بھی طرح طرح کے لسانی اور علاقائی تنازعات اٹھتے رہتے ہیں۔ اس وقت اگر نئی نسل کے کچھ ذہن قیام پاکستان کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہیں تو اس کا ایک سبب خود اہل اقتدار بالخصوص مسلم لیگی اہل اقتدار کا طرز عمل بھی ہے۔ علمی طور پر کسی کو کتنا ہی مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے جب تک عملی جواب نہ ہو بعض ذہنوں کی پورے طور پر تشفی نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ جلد اسے اپنی ذمہ داریوں کے ادراک اور اپنی سیاست کے انداز کو تبدیل کرنے کی توفیق دے۔ آمین

ضمیمہ

موضوع کی مناسبت سے بعض دوسرے مواقع پر راقم الحروف کے لکھے ہوئے چند مضامین شامل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے' جن سے موضوع کے بعض حصوں پر ان شاء اللہ مزید روشنی پڑے گی' یہ مضامین حسب ذیل ہیں:

"پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ کا جائزہ' محتاط طرز عمل کی ضرورت"

یہ مضمون ماہنامہ **الصیانۃ** کے اگست ۱۹۹۷ء کے شمارے میں بطور اداریہ شائع ہوا۔

"دینی سیاسی جماعتوں کی خدمت میں"

یہ مضمون الصیانہ کے جون ۱۹۹۳ء کے شمارے میں بطورِ اداریہ شائع ہوا تھا' اس میں اگرچہ اس وقت کے ملکی سیاسی حالات کی جھلک محسوس ہوتی ہے تاہم اکثر باتیں مستقل نوعیت کی ہیں۔

"تحریک پاکستان میں دینی طبقے کا کردار اور نوائے وقت"

یہ مضمون الصیانہ کے دسمبر ۱۹۹۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ کا جائزہ

محتاط طرزِ عمل کی ضرورت

اس سال پاکستان کا یوم آزادی گولڈن جوبلی کے طور پر منایا جا رہا ہے، قطع نظر اس کے کہ اس اصطلاح کی اصلیت اور شرعی حیثیت کیا ہے یہاں اس موضوع پر گفتگو اس حوالے سے کی جا رہی ہے کہ قوم اس موقع پر اپنی پچاس سالہ تاریخ کا جائزہ لینے اور کامیابیوں اور ناکامیوں کی بیلنس شیٹ پر غور کرنے کے موڈ میں نظر آ رہی ہے۔

ملک میں اس موقع پر مختلف طبقات کی طرف سے مختلف رویوں کا اظہار کیا جا رہا ہے' ایک طبقہ تو وہ ہے جسے رقص و سرود' راگ رانگی کی محفلیں سجانے اور داد عیش دینے کا بس کوئی بہانہ چاہئے' اس طبقے کو الگ مملکت حاصل کرنے کے اغراض و مقاصد' ان میں کامیابی یا ناکامی' مستقبل میں مایوسی کے تاریک سایوں یا امید کی کرنوں سے کوئی غرض نہیں' یہ طبقہ اپنے مخصوص انداز سے یہ دن منانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ان کے نزدیک ایک اسلامی نظریاتی مملکت کے یوم تاسیس اور ہیپی نیو ایئر (Happy New Year) جیسی تقریبات کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ اس مزاج کے لوگ خود سرکاری حلقوں میں بھی موجود ہیں جس کا اندازہ بعض شہروں کی بلدیاتی انتظامیہ کی طرف سے آتش بازی وغیرہ کے مظاہروں کے اعلانات سے ہوتا ہے۔

ایک محدود لیکن کافی اثر و رسوخ اور وسائل کا مالک طبقہ وہ ہے جسے اس بات کا پورا اندازہ ہے کہ اس مملکت خداداد کے ساتھ اسلام کا لیبل اتنی مضبوطی کے ساتھ چپک گیا ہے کہ اسے دور کرنا ممکن نہیں رہا اور انہیں یہ بھی احساس ہے کہ

محض لیبل کی حد تک بھی اسلام کتنا ''خطرناک'' ثابت ہو سکتا ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آنے والی دنیا کی واحد ریاست ہے اور عملی صورت حال جو بھی ہو بہر حال یہ دین اس ریاست کے تشخص کا لازمی جز بن چکا ہے۔ اب بظاہر یہ کسی کے لئے ممکن نہیں رہا کہ وہ سیکولرازم کو پاکستان کے بنیادی تشخص کے طور پر متعارف یا تسلیم کرا سکے' اس لئے ایک عرصہ قبل بعض حلقوں کی طرف سے یہ آواز اٹھا کرتی تھی کہ پاکستان اسلام کے نام پر نہیں بلکہ مسلمانوں کے محض معاشی حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے وجود میں آیا تھا لیکن بدلتی صورت حال میں اس لادین طبقے نے اپنی سٹریٹیجی (Strategy) تبدیل کر لی ہے' پہلے محاذ پر شکست کے اثرات دیکھ کر اب اس نے ایک نیا محاذ کھولا ہے اور وہ ہے کہ اس ملک کی افادیت و اہمیت لوگوں کے ذہنوں سے کم کی جائے' اس کے وجود و بقاء اور اس کی ترقی کے امکانات میں شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں' برے حالات کو اور زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے اور یوں ذہنی طور پر مفلوج' مرعوب اور خوف زدہ کر کے ہم سے من حیث القوم ملک کے تحفظ و دفاع اور جہاد کے جذبے کو اگر ختم نہ کیا جا سکے تو کمزور ترین ضرور کر دیا جائے۔ اسی حکمت عملی کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ نام نہاد ''روشن خیال'' اور ''وسیع الظرف'' دانشوروں اور فنکاروں اور سیاستدانوں کو آگے لایا جائے اور ان کے ذریعے دوستی' امن اور رواداری کے راگ الاپے جائیں۔ استعدادِ جہاد اور اعدادِ طاقت کے حکم قرآنی جسے ان کی اصطلاح میں محاذ آرائی کہا جاتا ہے کے معاشی ''نقصانات'' سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے اور اس طرح لوگوں کے ذہنوں میں تقسیم برصغیر کا غلط ہونا اچھی طرح راسخ کر دیا جائے اس لئے کہ یہ تقسیم جس نظریئے کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے اس سے عظیم ہندو امپریلزم جس کا دائرہ اثر خلیج عرب سے بھی آگے تک ہو پر ہی زد نہیں پڑتی بلکہ ہر سامراجی طاقت اور سکہ رائج الوقت بننے والے ہر باطل نظریئے پر پڑتی ہے۔

اس لئے دین کے نام پر عمل میں آنے والی تقسیم اور اس مملکت خداداد کے خلاف مذکورہ مہم کی سرپرستی صرف انڈیا ہی نہیں بلکہ یورپ' اسرائیل اور امریکہ سمیت تمام عالمی طاقتیں کر رہی ہیں۔ مغربی دنیا صدیوں سے عالم اسلام کی سب سے بڑی حریف چلی آ رہی ہے' ابھی تک صلیبی جنگوں کی تلخی کو نہیں بھولی ہے۔ صلیبی ذہنیت کے سامنے مسلم قومیت کا نعرہ خواہ وہ کتنی ہی کمزور حالت میں کیوں نہ ہو ایک انتہائی ڈراؤنا خواب بن کر سامنے آتا ہے' اس سے انہیں اتحاد عالم اسلام کی بو آتی ہے' اس کے پیچھے سے انہیں صلاح الدین ایوبی کے گھوڑوں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ عالمی صلیبی ذہنیت اور اس کی حلیف صہیونی ذہنیت اس بات کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ جس چیز کو دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے وہ کمزور سے کمزور شکل میں موجود ہو یا کسی بھی درجے میں اسے کسی مملکت کی اساس اور بنیاد قرار دیا جائے' بالخصوص ایسی ریاست جو یہ ثابت کر چکی ہو کہ وہ نامساعد حالات کے باوجود محض اپنے بل بوتے پر ایٹمی طاقت بن سکتی ہے۔ اس خطرے کے ازالے کے لئے ایک طرف اسے مکمل سیکولر ریاست قرار دینے کی کوشش کی گئی لیکن مطلوبہ کامیابی حاصل نہ ہونے کے بعد اسے کمزور کرنے' عالمی سطح پر بدنام کرنے اور عوام کا اپنے ملک سے جذباتی لگاؤ ختم یا کمزور کرنے کا راستہ اپنایا گیا ہے۔

چنانچہ اب عالمی لادینی طاقتوں کا سارا زور اسی نقطے پر صرف ہو رہا ہے۔ عالمی سطح پر اور اسی طرح پاکستان کے بلند مقتدر حلقوں کی سطح تک یہ بحث عرصے سے جاری ہے کہ پاکستان ایک ناکام ملک ہے۔ اب اس ذہنیت کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے عوامی سطح تک پھیلانے کی کوشش ہو رہی ہے' بعض اوقات معمولی معمولی باتوں کو اچھال کر قوم کو مایوسی کی انتہا تک پہنچانے کے لئے نت نئے طریقے اور حربے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ اگر بھارت کسی نئے میزائل وغیرہ کا تجربہ کرتا ہے تو اسے داد دی جاتی ہے کہ دیکھئے انہوں نے پچاس سال میں کتنی ترقی کر لی ہے اور اس

بات کو نظر انداز کیا جاتا ہے کہ ان پروگراموں کے لئے اس نے کتنے غریب عوام کا پیٹ کاٹا ہے۔ دوسری طرف اگر پاکستان اپنے عوام کو بھارت سے بہر حال بہتر معاشی سہولتیں فراہم کر کے چھوٹا ملک ہونے اور عالمی دباؤ کے باوجود اس کے جواب میں کوئی کامیاب تجربہ کرتا ہے تو اسے محاذ آرائی ترک کرنے کا "دانش مندانہ" مشورہ دیا جاتا ہے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ تحریک پاکستان کے قائدین کو عالمی سطح پر بدنام اور مطعون کیا جائے۔ چنانچہ آج مغربی میڈیا کے دہانے ان کے خلاف کھلے ہوئے ہیں اور ان کے خلاف تقریباً وہی زبان استعمال ہو رہی ہے جو پچاس سال پہلے کانگریس کے پلیٹ فارم سے استعمال ہوتی تھی۔ ان کی کردار کشی کی مہم درحقیقت ایک بڑی مہم کا حصہ ہے، یہ کردار کشی صرف اس لئے ہو رہی ہے کہ تاریخ میں ان لوگوں کا نام ایک نظریئے اور نظریاتی ریاست کے ساتھ نتھی ہو گیا ہے۔

اس موقع پر مخصوص سازش کے تحت ملک دہشت گردی کی نئی لہر میں مبتلا کر دیا گیا ہے، اس کے بھی بنیادی مقصد دو نظر آتے ہیں: ایک دین دار اور دین کی خدمت کرنے والوں کو بدنام کر کے اور لوگوں کو خوف زدہ کر کے ان سے دور کرنا دوسرے قوم کو خاص ذہنی تناؤ میں مبتلا کرنا تاکہ آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر اپنے حالات کو دیکھ کر ایک خاص قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو۔

اس طرح ہم پر ایک زبردست نفسیاتی جنگ مسلط کی جا چکی ہے جس سے ہمیں بڑی دانشمندانہ حکمت عملی سے عہدہ برا ہونا ہے۔ اس موقع پر اپنی کارکردگی کا جائزہ اور محاسبہ بہت ضروری ہے، یہی چیز قوموں کے لئے حیات نو کا باعث بنتی ہے۔ جو قوم اپنا محاسبہ اور مواخذہ خود نہ کرے اس کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا، لیکن اس عمل میں یہ احتیاط بہر حال ضروری ہے کہ ایسا مایوس کن انداز اختیار نہ کیا جائے جس سے مذکورہ بالا نفسیاتی جنگ میں دشمن کی غیر شعوری طور پر تائید ہو رہی ہو۔

پچاس سال کے عرصے میں جہاں ہمیں متعدد ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے وہیں بہت سی سنہری کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں، جہاں ہماری پچاس سالہ تاریخ کے چہرے پر کچھ بدنما داغ ہیں وہی قابل فخر روشنیاں بھی موجود ہیں، جہاں مایوسیوں کے تاریک بادل ہیں وہیں انہیں بادلوں میں امید کی روشن لکیریں اور انہیں بادلوں سے باران رحمت برسنے کے امکانات بھی الحمدللہ موجود ہیں۔ ہمیں پچاس سالہ تاریخ کا نقشہ دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر پیش کرنا چاہئے۔

ہمارے ملک میں دینی ادارے، جماعتیں اور دینی صحافت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں، یہی دین کے تحفظ وبقاء اور اس کے نفاذ کا ذریعہ ہیں۔ دینی اعتبار سے ملک کے تاریک پہلوؤں پر تشویش اور کرب ان کے لئے ایک فطری امر ہے جس پر یہ درحقیقت مبارکباد کے مستحق ہیں لیکن دینی صحافت کو بھی اس نازک موقع پر بہت ہی دانشمندانہ حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صحافت نظریاتی محاذ پر فرض کفایہ ادا کر رہی ہے لیکن کامیاب فوج وہی ہوتی ہے جو دشمن کی بدلتی ہوئی چالوں پر نظر رکھے، دشمن نیا محاذ کھول چکا ہو تو پرانے خالی مورچوں پر فائرنگ کرتے رہنا دانشمندی کا تقاضا نہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی صورت حال بالکل مختلف تھی اور اب پچاس برس بعد دشمن بہت سے پینترے بدل چکا ہے، اس کا بڑا ہدف اب ملک کو کمزور کرنا، مایوسی پھیلانا، تقسیم برصغیر کو غلط قرار دینا اور ملک سے عوام کے جذباتی لگاؤ کو ختم کرنا بن چکا ہے، مغرب اور اس کے پروردہ "روشن خیال" لوگوں کا سارا زور اسی پر صرف ہو رہا ہے۔ ہمیں برائیوں پر بے چینی کا اظہار اس انداز سے کبھی نہیں کرنا چاہئے کہ غیر شعوری طور پر ہماری آواز اس مذکورہ طبقے کی آواز سے ہم آہنگ ہو جائے۔

لیکن اس کا یہ مقصد بھی نہیں ہے کہ ہم نے بحیثیت ملک و قوم اپنی منزل کے حصول میں جو ٹھوکریں کھائیں ان سے صرف نظر کر لیا جائے اس لئے کہ ان

سے صرف نظر تو اجتماعی خودکشی کے مترادف ہے۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قوم کو مایوس کرنے کی بجائے اسے مایوسی کے گڑھوں سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس قسم کی انتہاء پسندانہ باتوں سے گریز کرنا چاہئے کہ ہمیں اپنی آزادی پر خوشی منانے کا کوئی حق ہی حاصل نہیں ہے۔

خود راقم الحروف نے قلم پچاس سالہ تاریخ پر محاسبانہ نظر ڈالنے کے لئے اٹھایا تھا لیکن اس تمہید میں بات لمبی ہو گئی' حق تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ مفید ہو گی' اصل موضوع پر زندگی رہی تو پھر گفتگو ہو سکتی ہے۔

دینی سیاسی جماعتوں کی خدمت میں

گزشتہ شمارے میں موجود مضطرب سیاسی فضاء پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ موجودہ بڑے سیاسی گروہوں سے پوری طرح اصلاح احوال خصوصاً اس ملک کے بنیادی نظریے کے لئے کوئی اہم اور بڑا قدم اٹھانے کی توقع رکھنا عبث ہے۔ ایسے حالات میں اگر ایک دردمند پاکستانی کی نظر کسی طرف اُٹھ سکتی ہے تو وہ ملک کی دینی سیاسی جماعتیں ہیں جو اپنی تمام سیاسی جدوجہد کا مقصد نفاذ اسلام کو ٹھہراتی ہیں' لیکن ان جماعتوں کی حالت اتنی پتلی اور عوامی اثر و نفوذ کی ان میں اتنی کمی ہے کہ حالت موجودہ ان سے بڑے مؤثر کردار کی امید بہت کم ہے۔ موجودہ سیاسی فضا کی گندگی' سیاسی کامیابی کے حصول کا بے پناہ دولت پر موقوف ہونا دین اور اہل دین کے خلاف مؤثر غلط پروپیگنڈا وغیرہ جہاں اس کا سبب ہیں وہیں خود ان جماعتوں کی اپنی خامیاں بھی کافی حد تک اس صورت حال کی ذمہ دار ہیں' اس لئے گزشتہ شمارے میں دینی سیاسی جماعتوں کی خدمت میں محبانہ' مخلصانہ اور دردمندانہ گزارشات کا وعدہ کیا گیا تھا۔

سب سے پہلی گزارش تو وہی ہے جو سابقہ شمارے میں کی گئی تھی کہ ان جماعتوں کی سب سے بڑی ضرورت ان کا آپس کا اتحاد و اتفاق ہے۔ اتحاد و اتفاق کی ضرورت و اہمیت اور اختلاف و انتشار کے نقصانات اور بے برکتیاں کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جس پر دلائل دینے کی ضرورت ہو' لیکن اتحاد و اتفاق کی اہمیت جتنی واضح ہے اتنا ہی ہماری یہ جماعتیں اس سے کوسوں دور ہیں' صرف مختلف جماعتوں ہی کے آپس کے اختلافات نہیں بلکہ ایک ایک جماعت کئی کئی گروپوں میں تقسیم ہو چکی ہے' اگر اتحاد کی کچھ کوششیں ہوتی بھی ہیں تو ان میں بھی تنافس اور ڈیڑھ اینٹ کی مسجد والے طرز عمل کی بو محسوس ہوئے نہیں رہتی' بعض جماعتیں اتحاد سے زیادہ

اتحاد کے کریڈٹ یا اتحاد میں اپنے لئے سب سے اہم مقام کیلئے کوشاں نظر آتی ہیں' اگر کہیں اتحاد ہوتا بھی ہے تو عموماً ناپائیدار ثابت ہوتا ہے جس کی بڑی وجہ غالباً یہی ہے کہ عموماً ہماری نظر وقتی نوعیت کے مسائل پر ہوتی ہے کوئی بھی وقتی موضوع ہمارے جذبات کا مسئلہ بن کر اتحاد کا سبب بن جاتا ہے اور اس کا جوش ٹھنڈا ہو جانے پر ہم دوبارہ اپنی پرانی حالت پر لوٹ آتے ہیں۔ مستقل اور بنیادی مسائل پر ہمارے جذبات اتنے حساس نہیں ہوتے کہ وہ ہمیں مستقلاً ایک پلیٹ فارم پر متحد کر سکیں۔

پائیدار اتحاد کے فقدان کے اسباب کی مکمل کھوج تو وہی حضرات لگا سکتے ہیں جو موجودہ سیاست سے واقفیت اور ان جماعتوں کے مزاج اور اندرونی باتوں کا علم رکھتے ہیں۔ یہی حضرات انہیں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے ذرائع اور وسائل سوچ سکتے ہیں' ہم ان جماعتوں کے ذمہ داران کی خدمت میں دست بستہ اتنی ہی گزارش کر سکتے ہیں کہ خدارا ملک و قوم اور اپنی جماعت کی حالت پر رحم فرمایئے اور موجودہ انتشار کے مستقبل میں ظاہر ہونے والے بھیانک نتائج پر غور فرمایئے۔ وقت بڑی تیزی کے ساتھ گزر رہا ہے' اگر بالفرض مستقل پائیدار اتحاد کے امکانات مفقود ہوں تو بھی کم از کم اختلاف میں کشیدگی کی فضاء سے تو مکمل پرہیز کیا جائے' اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر کام کیا جائے لیکن ایک دوسرے سے ایسا بعد نہ ہو کہ کسی کڑے وقت میں ایک میز پر اکٹھے ہونا ہی مشکل ہو جائے۔

دینی سیاست کا مطلب ملک کو ایسی صالح قیادت و حکومت مہیا کرنے کی کوشش کرنا ہے جو ملکی باشندوں کو امن وامان' عدل وانصاف اور انفرادی و اجتماعی سطح پر اطاعت خداوندی کے مواقع مہیا کرے۔ ایسی قیادت صالح یقیناً اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت اور ایسی قیادت کا نہ ہونا عذاب الٰہی ہے۔ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی نعمت کا حصول اور عذاب الٰہی سے بچاؤ احکام خداوندی کی اتباع کے ذریعے ہی ممکن ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کما تکونون یؤمر علیکم. جیسے تم ہو گے

ویسے ہی تم پر حکمران مقرر کیے جائیں گے۔ (مشکوٰۃ ص ۳۲۳)

اسی طرح حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں۔ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں بادشاہوں کا مالک اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں' بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں اور بندے جب اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے دلوں کو رحمت اور نرمی کی طرف موڑ دیتا ہوں اور نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے دلوں کو غصہ اور تکلیف دہی کی طرف پھیر دیتا ہوں اور وہ لوگوں کو بدترین تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔ لہٰذا تم خود کو حکمرانوں کے خلاف بددعاؤں میں مشغول نہ کرو بلکہ ذکر الٰہی اور (اللہ کے سامنے) عاجزی میں مشغول ہو جاؤ تاکہ میں تمہیں کافی ہو جاؤں۔
(مشکوٰۃ ص ۳۲۳ و مجمع الزوائد ص ۲۵۲/ ج ۵)

ان احادیث کی سندوں پر کلام کی گنجائش موجود ہے لیکن دلائل شرعیہ کا عمومی جائزہ لینے کے بعد ان کے قدر مشترک مضمون کے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی' یعنی یہ بات واجب التسلیم ہے کہ اچھی حکومت کے حصول میں مسلمانوں کے عمومی دینی حالات کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔

آج کل تو ویسے بھی جمہوریت' سیاست کی دنیا میں سکہ رائج الوقت کی حیثیت اختیار کر گئی ہے حتی کہ بعض اوقات بعض علماء کے ہاں بھی صرف وہی اسلام قابل قبول ہوتا ہے جو جمہوریت کے راستے سے آیا ہو اور جمہوری حکومت کو عوام کے مزاج و مذاق کا عکاس سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا جمہوریت کے راستے سے اسلام لانے کے لئے بھی جمہور کی دینی اصلاح ضروری ہے۔

حاصل یہ کہ اتباع شریعت کو نفاذ شریعت کی جدوجہد سے الگ نہیں کیا جا سکتا' ہماری دینی سیاسی جماعتوں کو اس طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے' اس سلسلے میں مندرجہ ذیل گزارشات ضروری معلوم ہوتی ہیں:

(۱)۔۔۔۔ جو جماعتیں اس وقت ہماری مخاطب ہیں وہ صرف سیاسی جماعتیں نہیں بلکہ دینی سیاسی جماعتیں ہیں‘ ان کا نصب العین عام بازاری قسم کی سیاست سے بہت بلند ہے‘ ان کا مقصد اسلامی سیاست کا نمونہ پیش کرنا ہے‘ انہیں اپنی تمام تر پالیسیاں شریعت مقدسہ کے مطابق بنانی چاہئیں‘ کسی بھی مقصد کے لئے کوئی قدم بھی ایسا نہیں اٹھنا چاہئے جو شریعت اسلامیہ میں ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ دینی سیاسی جماعت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ ایسی جماعت بر سر اقتدار آکر دین نافذ کرنا چاہتی ہے‘ اگر کوئی جماعت سیاسی عمل کے دوران اپنی پالیسیوں میں شریعت کی طرف سے مقرر کردہ حدود و قیود کی تصلب کے ساتھ پابند نہیں تو کوئی اس سے یہ توقع کیسے رکھ سکتا ہے کہ وہ بر سر اقتدار آکر حکومتی پالیسیوں میں شریعت کی مکمل پابندی کرے گی۔ سیاسی پالیسیوں میں احکام شریعت کی خلاف ورزی سے جہاں عند اللہ مواخذہ کا خطرہ ہے وہیں اس سے دنیا میں بے برکتی بھی ہوتی ہے‘ اس لئے دینی جماعتوں کے ذمہ داران سے ہماری مخلصانہ اور مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ کسی بھی پالیسی کو اپنانے سے قبل اس کے شرعی جواز و عدم پر غور فرمالیا کریں۔ اگر کسی مسئلہ میں تردد ہو تو محققین اہل فتویٰ سے رجوع کرنے میں بھی عار محسوس نہ کی جائے۔

(۲)۔۔۔۔ جماعت کے عہدیداران اور کارکنان کی اپنی زندگیوں میں بھی تقویٰ اصلاح کا رنگ غالب ہو‘ عہدیداروں کے انتخاب میں اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ وہ کسی باخدا بزرگ کے تربیت یافتہ یا کم از کم زیر تربیت ہوں‘ اسی طرح کارکنوں کی تربیت میں بھی اس پہلو پر خصوصی توجہ دی جائے۔ قرآن و حدیث اور اکابر کے حالات و واقعات کے ذریعے ان میں تقویٰ و طہارت‘ اخلاص و للّٰہیت‘ ایثار و ہمدردی اور ذوق عبادت جیسے اوصاف پیدا کرنے کا اہتمام کیا جائے‘ خاص طور پر جو حضرات اپنی جماعت یا اپنے کام سے باقاعدہ وابستہ نہ ہوں ان کے بارے میں اچھا رویہ رکھنے کو اپنی شرعی ذمہ داری سمجھیں‘ اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا حوصلہ

پیدا کیا جائے‘ اگر عہدیداران و کارکنان میں ان اوصاف کا عام ماحول پیدا ہو گیا تو انشاء اللہ کام میں بھی منجانب اللہ برکت ہوگی اور آئے روز رونما ہونے والے انتشار اور گروپ بندیوں میں بھی کافی حد تک کمی ہو جائے گی۔

(۳)۔۔۔۔ عوام کی عقائد‘ عبادات‘ معاملات‘ معاشرت اور اخلاق کے شعبوں میں ہمہ گیر دینی اصلاح کی فکر کی جائے‘ ان میں دین پر عمل کا جذبہ بھی پیدا کیا جائے اور دین کا جامع اور صحیح و سلیم فہم بھی ان کو دیا جائے۔ ہمارا معاشرہ جس قسم کی دینی و اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو چکا ہے اس کے برقرار رہتے ہوئے کسی پائیدار اچھی سیاسی تبدیلی کی خواہش ایک خواب شیریں ہی ہے جس کی حقیقت اور واقعہ کی دنیا میں کوئی تعبیر نہیں ہے‘ اس لئے دیندار طبقوں کی سب سے پہلی ترجیح معاشرے کو موجودہ پستی سے نکالنا ہونی چاہئے‘ سیاسی جدوجہد جاری رکھی جائے لیکن عارضی طور پر اس کی حیثیت ثانوی رکھی جائے‘ اصل توجہ پہلے کام کی طرف ہو‘ اگر کسی وجہ سے دینی سیاسی جماعتیں اس شعبے کو نہ اپنا سکیں یا اس پر پوری توجہ نہ دے سکیں تو کم از کم جو افراد‘ ادارے اور جماعتیں باقاعدہ سیاسی وابستگی کے بغیر خاموشی کے ساتھ دعوت و تبلیغ اور خلقِ خدا کی اصلاح و تربیت میں مشغول ہیں انہیں اپنا معاون سمجھا جائے اور اپنے کارکنوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرادی جائے کہ یہ ہمارے فریق نہیں رفیق ہیں اور ان کا کام ہماری کامیابی کیلئے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہماری دینی سیاسی جماعتوں میں طویل المیعاد منصوبہ بندی کا فقدان بھی واضح طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ عموماً ہماری ساری محنتوں کا محور وقتی حالات ہی ہوتے ہیں انہی سے نمٹنے کے لئے ہر طرح کی جدوجہد کی جاتی ہے۔ گزشتہ پینتالیس سالوں کے دوران دینی طبقوں کے اثر و نفوذ اور ان کی مقبولیت کا گراف جس طرح نیچے آیا ہے اور اب جس طرح کی صورت حال ہو چکی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ صحیح

بنیادوں پر الف ' ب سے اپنے کام کی ابتداء کی جائے گو وقتی سیاسی حالات سے صرف نظر نہ کیا جائے لیکن محنت کا اصل میدان ان مستقل پالیسیوں کو بنایا جائے' ابتداء سے کی جانے والی اس محنت میں مندرجہ ذیل امور پر خصوصی توجہ دی جائے :

(۱)۔۔۔۔۔ ایسے افراد کار کی تیاری جو اخلاص و للّٰہیت' تقویٰ و طہارت اور دینی نظریات کے ساتھ گہری وابستگی کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں صلاحیت اور قابلیت کے مالک ہوں' ان میں معتدبہ تعداد ایسے علماء دین کی ہو جو زندگی کے تمام شعبوں میں پیش آنے والے مسائل کا دقت و گہرائی اور سلامت فکر کے ساتھ ایسا دینی حل پیش کر سکیں جو زمانہ کے مقتضیات کے مطابق ہو' اسی طرح دین بالخصوص اس کے اجتماعی نظریات پر ہونے والے شبہات کے تسلی بخش جواب دے سکیں۔ اس وقت رجال کار کا قحط ہے کہ اگر بالفرض زمام حکومت مکمل طور پر کسی دینی سیاسی جماعت کے حوالے کر بھی دی جائے تو وہ بھی شاید اپنے نظریے کو مکمل طور پر نافذ نہ کر سکے۔

(۲)۔۔۔۔۔ جماعت کے ساتھ وابستگان کی فکری و نظریاتی تربیت کا خاطر خواہ انتظام ہو' ان کی نظریاتی تربیت ایسے مؤثر انداز سے ہو کہ وہ دوسروں کو متاثر کر سکیں۔

(۳)۔۔۔۔۔ خالی نعروں اور جذباتی بیانات کے ذریعہ لوگوں میں وقتی اشتعال پیدا کرنے کی بجائے ٹھوس بنیادوں پر مستقل طور پر رائے عامہ ہموار کرنے اور عوام کے اندر معتدبہ تعداد میں جماعت کے مستقل ہمدرد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے' اس مقصد کے لئے باقاعدہ سیل قائم کئے جائیں جو اس سلسلے میں تدابیر پر غور کرتے رہیں۔

(۴)۔۔۔۔۔ جماعت کے اندر نظریاتی تحقیق کو خصوصی اہمیت دی جائے' ایسے سیل اور ونگ قائم کئے جائیں جو دستور و آئین سے لے کر زندگی کے عام معمولی سمجھے جانے والے شعبوں تک میں غور کر کے ہر شعبے میں اصلاح احوال کے لئے واضح نظریہ اور تجاویز مرتب کریں تا کہ کسی شعبے میں کسی موقع پر اختیارات کے استعمال

کا موقع ملے تو فوراً صحیح سمت اور رخ میں عمل شروع ہو جائے' یہ نظریاتی تحقیقی سیل جماعت کی عام پالیسیوں کی تائید و حمایت کی ذمہ داری سے آزاد ہوں' اس مقصد کے لئے ان محقق علماء اور دانشوروں کی خدمات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں جو اس جماعت کے ساتھ باقاعدہ وابستہ تو نہیں لیکن اس کے مقاصد و اہداف سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

مختلف جماعتوں کے عمومی تعلقات کیسے بھی ہوں' کم از کم اس بات پر اتفاق کیا جائے کہ ان تحقیقی نظریاتی شعبوں کے مشترکہ اجلاس یا سیمینارز وغیرہ ہوتے رہیں گے۔ مشترکہ غور و خوض سے ایک تو بہتر اور زیادہ مفید تجاویز سامنے آئیں گی' دوسرے اس سے جماعتوں کے موجودہ بعد میں بھی کافی کمی واقع ہو گی۔ اب تک ان جماعتوں کے وابستگان کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا فلاں فلاں جماعت سے کس کس نقطہ پر اختلاف ہے۔ مشترکہ غور و فکر سے انشاء اللہ یہ احساس تیزی سے ابھرے گا کہ جن مسائل کا سیاست سے تعلق ہے ان میں اتفاقی امور زیادہ اور اختلافی نکات بہت ہی کم ہیں' جن مسائل میں اختلافات ہیں ان کا عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے' اس سے انشاء اللہ مقاصد میں یگانگت و اتحاد کا احساس پیدا ہو گا' نفرتیں اور کدورتیں کم ہو کر مستقل اور پائیدار اتحاد کی راہ ہموار ہو گی۔

دینی سیاسی جماعتوں کے علاوہ دین دار طبقوں میں ایسے حضرات یا تنظیم کا وجود بھی ضروری ہے جس کی کارکردگی تقریباً اس سے ملتی جلتی ہو جس کا تذکرہ علم سیاسیات میں Interest Group یا پریشر گروپ (Pressure Group) کے عنوان سے کیا جاتا ہے۔ یہ گروہ باقاعدہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں ہوتے یہ عام سیاسی عمل میں باقاعدہ شریک ہوتے ہیں' سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر اپنے مخصوص مفادات یا اہداف کے لئے کوشش کرتے اور اس سلسلے میں سیاست پر

بلاواسطہ طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لابنگ (Lobbing) وغیرہ مختلف طریقوں سے رائے عامہ اور ارکان مقننہ کے ذہنوں کو اپنے حق میں ہموار کرتے ہیں‘ انہیں نام اور کریڈٹ سے نہیں بلکہ اپنے مقاصد کے حصول سے غرض ہوتی ہے‘ ان گروہوں کی مثال ایوان صنعت و تجارت وغیرہ سے دی جاتی ہے۔ دیندار طبقوں بالخصوص علماء میں بھی کچھ لوگ دنیوی نام و نمود کی قربانی دے کر اس قسم کے کردار کے لئے تیار ہو جائیں۔ وہ بھی باقاعدہ سیاسی وابستگی سے بالاتر ہو کر ایک طرف تو عوام بالخصوص تعلیم یافتہ طبقے کی ایسی فکری تربیت کریں کہ دینی سیاست کی کامیابی کے لئے راہ ہموار ہو اور دوسری طرف مؤثر شخصیات بالخصوص ارکان حکومت و ارکان مقننہ سے رابطہ رکھ کر جس شعبے میں بھی اصلاح کا کوئی کام کروا سکیں کروائیں لیکن ان روابط سے ذاتی مفادات کے حصول کا تصور تک دل میں نہ لائیں‘ ایسی بے لوث محنت و کوشش جس میں نہ مالی منفعت ہو اور نہ ہی جاہ و شہرت ہو یقیناً بہت مشکل کام ہے لیکن جو دین کے نام لیوا ہیں ان کا طرہ امتیاز ہی اخلاص و للّٰہیت اور اس قسم کا بے لوث جذبہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انتخابی سیاست سے الگ رہ کر اصلاح احوال کی جدوجہد کے اتنے اور ایسے میدان ہیں کہ ان پر اگر صحیح توجہ دی جائے تو نہ صرف یہ کہ بہتر نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں بلکہ ان کے زیادہ پائیدار ہونے کی بھی توقع ہے۔

اب تعلیم ہی کو لے لیجئے‘ ملک کی سیاسی قیادت سے زیادہ حکمرانی بیوروکریسی اور سول انتظامیہ کرتی ہے اور یہ لوگ تعلیم کے ذریعے آگے آتے ہیں‘ لیکن جن اداروں میں یہ تعلیم حاصل کرتے ہیں وہاں بچپن ہی سے ان کی خاص انداز پر تربیت اور ذہن سازی کی جاتی ہے‘ اگر ملک و ملت اور دین کے ساتھ لگاؤ رکھنے والے لوگ ایسے ادارے قائم کریں جن میں کم آمدن والے طبقے کے ذہین بچوں کو بہترین ماحول میں اعلیٰ ترین تعلیم مفت دی جائے اور جہاں ضرورت ہو تو کچھ عرصے

بیرون ملک تعلیم کے لئے سکالرشپ اور دیگر سہولتیں بھی فراہم کی جائیں‘ پاکستان میں اہل ثروت مخیر طبقے کو اللہ تعالیٰ نے جو فراخدالی عطاء فرمائی ہے اس کے پیش نظر یہ کام اتنا مشکل نہیں ہے۔

یہ کام اگر کر لیا جائے تو اگرچہ فوری اثرات ظاہر نہ ہوں لیکن جب ظاہر ہوں گے جاندار ہوں گے‘ نہ صرف یہ کہ اس سے ہماری ہیئت مقتدرہ میں اچھے لوگ کافی تعداد میں پہنچ جائیں گے بلکہ ہر شعبے میں اچھا ذہن رکھنے والے قابل اور پیشہ ور لوگ خاصی تعداد میں موجود ہوں گے جو اور بھی کئی لوگوں کو متاثر کریں گے۔ یاد رکھئے دعوت اور دوسروں کو متاثر کرنے کی بنیاد بھی پیشہ وارانہ مہارت ہی ہے‘ ایک وکیل قانون دانوں کے حلقے میں مؤثر داعی تبھی بن سکتا ہے جب کہ اس شعبے میں وہ پیشہ وارانہ عزت اور مقام بھی حاصل کرے۔

کوئی تبدیلی خواہ جمہوری طریقے سے لانی مقصود ہو یا کسی انقلابی راستے سے‘ اس کیلئے رائے عامہ کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا‘ جمہوری ملکوں میں اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے‘ اس لئے نفاذ اسلام کی راہ ہموار کرنے کیلئے رائے عامہ کی تشکیل میں کردار ادا کرنے والے شعبوں میں کنٹرول حاصل کرنا بھی بہت ضروری ہے‘ جن میں ذرائع ابلاغ خاص طور پر شامل ہیں۔ ہمارے پاس ایسے ادارے ہونے چاہیں جو مروجہ اور مسلمہ پیشہ وارانہ معیاروں پر پورا اترتے ہوئے ان شعبوں میں نمایاں مقام حاصل کریں اور اسے اسلامی کاز (Cause) کے لئے استعمال کریں۔

کسی تنظیم یا فرد کے بارے میں ہمیں شبہ ہو کہ وہ انسانی حقوق‘ اقلیتوں کے حقوق یا حقوق خواتین وغیرہ کے نام پر کسی غیر ملکی ایجنڈے پر کام کر رہا اور ڈالر بٹور رہا ہے تو نعرہ بازی پر اکتفا کرنے کی بجائے تحقیقی صحافت (Investigative Journalism) کی تکنیک کو پوری مہارت کے ساتھ استعمال کر کے اصل حقیقت کو ناقابل تردید طریقے سے آشکارا کر دیا جائے۔ اسی طرح آج

کل مختلف قسم کے سروے صرف رائے عامہ کی پیمائش ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی اشاعت رائے عامہ کی تشکیل میں بھی بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے' ہمارے پاس ایسے ادارے ہونے چاہئیں جو اس شعبے میں اپنی حیثیت تسلیم کرا کے اسے اعلیٰ مقاصد کے لئے استعمال کریں' میں یہاں ایک مثال عرض کروں گا' ہمارے ہاں یہ بات اب محاورہ کا درجہ حاصل کرتی چلی جا رہی ہے کہ مساجد میں ایک دوسرے کو کافر کہا جاتا اور اس کے قتل پر ابھارا جاتا ہے اور یہ بات کہتے ہوئے اس بات کی تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی کہ اس میں کتنی صداقت ہے' حالانکہ اگر ملک بھر کے خطبات جمعہ کا ایک غیر جانبدارانہ سروے کیا جائے تو یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اس بات میں کتنی صداقت اور کتنا مبالغہ ہے۔

یہ تو چند مثالیں تھیں' عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انتخابی سیاست اور انقلاب کے نعروں کے علاوہ بھی کام کا ایک وسیع میدان موجود ہے۔

گزارشات تو اور بھی ذہن میں آ رہی ہیں لیکن انہی چند بے ربط باتوں پر اکتفا کر کے بات کو ختم کیا جاتا ہے یہ باتیں بھی یقیناً چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق ہوں گی' لیکن الدین النصیحۃ کے مقتضا پر عمل کرتے ہوئے عرض کر دی گئی ہیں جس کا مقصد کسی پر تنقید یا کسی کی تحقیر نہیں بلکہ ان جماعتوں سے اپنائیت کا جذبہ اس کا باعث ہے۔ اگر کہیں انداز بیان کی وجہ سے کسی کی دل آزاری ہو گئی ہو تو امید ہے کہ اسے اظہار مافی الضمیر کوتاہی پر محمول کر کے معاف کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری حالت پر رحم فرماویں۔

محمد زاہد

۱۴ ذوالحجہ ۱۴۱۳ھ

تحریک پاکستان میں دینی طبقے کا کردار اور نوائے وقت

حال ہی میں روزنامہ نوائے وقت کے متعدد اداریوں میں موجودہ سیاسی صورت حال میں دینی عنصر کے کردار کو مختلف حوالوں سے موضوع سخن بنا کر ان میں تقریباً ایک جیسی باتیں دہرائی گئی ہیں۔ بعض ایسے پہلو بھی زیر بحث لائے گئے ہیں جو محض وقتی مسئلہ (Issue) ہی نہیں بلکہ مستقل تاریخی اور نظریاتی اہمیت رکھتے ہیں اور نوائے وقت میں جس انداز سے ان پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور عموماً کیا جاتا ہے وہ بڑی حد تک مبالغہ انگیز اور غلط فہمیوں کا باعث ہے۔ اس لئے اسلام اور پاکستان کے ساتھ کمٹمنٹ کی وجہ سے نوائے وقت کا دل میں احترام ہونے کے باوجود ان خیالات پر مجبوراً قلم اٹھانا پڑ رہا ہے۔

اس وقت ۲۴ اکتوبر اور ۱۱ نومبر ۱۹۹۵ء کے اداریے پیش نظر ہیں۔ ان میں براہ راست تو جماعت اسلامی کو مخاطب بنایا گیا ہے لیکن ساتھ ہی دوسری دینی قوتوں کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ ۲۴ اکتوبر کے اداریے میں جماعت اسلامی اور مسلم لیگ میں باہمی مفاہمت کے بعد دوری کے اسباب "اسلام اور پاکستان کے حوالے سے قدرے مختلف نقطہ نظر اور قیام پاکستان کی تحریک میں متضاد کردار" کو قرار دیا گیا ہے' سیاق و سباق اور دوسرے اداریوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بریلوی مکتبہ فکر کے علاوہ باقی دینی جماعتوں کے بارے میں بھی ان کی یہی رائے ہے۔ نوائے وقت کی اس رائے سے عام سمجھ بوجھ کا انسان بھی سراپا حیرت بن جاتا ہے' خان عبدالغفار خان اور ان کے فرزند ولی خان کا تحریک پاکستان کے خلاف کردار اور قیام پاکستان کے بعد ان کے افکار و نظریات کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اور نہ ہی کبھی انہوں نے اسے چھپانے کی کوشش کی ہے (اس لئے کہ آزادی اظہار کا یہ "اعلیٰ

معیار" بد قسمتی سے شاید پاکستان کے حصے میں آیا ہے کہ یہاں مملکت کے وجود ہی کے جواز اور اس کی نظریاتی اساس کے خلاف کھلم کھلا نظریات رکھنے بلکہ ان کا پرچار کرنے کے باوجود لیڈر بلکہ "بزرگ سیاستدان" بنا جا سکتا ہے) اور یہ لوگ آخر تک پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے نظریات پر قائم ہیں' اس کے باوصف ان کی اے این پی کا مسلم لیگ کے ساتھ مستحکم اتحاد قائم ہے بلکہ شاید مسلم لیگ کا کسی جماعت کے ساتھ سب سے پائیدار اتحاد ثابت ہوا ہے اور بات یہاں تک ہے کہ مسلم لیگ کی سابقہ حلیف دینی جماعتوں کو یہ شکایت رہی ہے کہ جناب نواز شریف صاحب نے اپنے دور اقتدار میں آئی جے آئی میں شامل جماعتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انتخابات میں کیئے گئے وعدوں سے ہٹ کر اے این پی اور ایم کیو ایم کے سہارے حکومت چلانے کی کوشش کی ہے۔ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے مدیر نوائے وقت نے نہ معلوم مسلم لیگ کو پاکستانیت کے معاملے میں اتنا "پرہیزگار" کیسے باور کر لیا ہے کہ اب یہ کسی ایسی جماعت کے ساتھ نہیں چل سکتی جس کے بڑوں میں سے کسی نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی ہو۔

اصل میں ہونا تو یہ چاہئے کہ جن لوگوں نے اپنے طور پر دیانتداری اور مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کے جذبے سے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی لیکن قیام پاکستان کے بعد ان کی طرف سے کوئی ایسی چیز سامنے نہیں آئی جو حب وطن کے تقاضوں کے خلاف ہو جس سے دانستہ مملکت کی بنیادوں کو نقصان پہنچانے کا شائبہ پایا جاتا ہو بلکہ اس کے برعکس انہوں نے اپنے حلقہ اثر میں ہمیشہ نئی مملکت کے تحفظ اور استحکام اور اسے اپنی منزل مقصود تک پہنچانے کی کوشش کرنے اور اس کی خاطر ہر قربانی کیلئے تیار رہنے کی ترغیب دی ہو ان کے قیام پاکستان سے پہلے کے کردار کی وجہ سے انہیں اور ان سے محبت و عقیدت رکھنے والوں کو طعن و ملامت کا نشانہ نہ بنایا جائے اس لئے کہ واقعاتی حقائق یا دلائل شرعیہ کی رو سے ان حضرات کی رائے کو

جتنا بھی غلط قرار دے لیا جائے بہر حال انہوں نے دیانت داری سے جس بات کو درست اور مفید سمجھا اس کا مسلمانوں کو مشورہ دے کر انہوں نے اپنا سیاسی' قانونی اور شرعی حق استعمال کیا ہے کوئی جرم نہیں کیا۔ اصل دیکھنے کی چیز قیام پاکستان کے بعد کا کردار ہے' جن لوگوں نے پاکستان میں رہتے ہوئے آج تک اس کے وجود کو صحیح معنوں میں تسلیم نہیں کیا اور جن کی بھارت نوازی کے نت نئے قرائن و شواہد بھی سامنے آتے رہتے ہیں (جس کی واضح مثال لندن میں پاکستان کی بجائے بھارت کے سفارت خانہ میں یوم آزادی کی تقریبات میں شرکت ہے) ان کو پاکستان کی سیاسی بساط سے خارج کرنے یا ان سے اپنے سابقہ نظریات اور "حقائق حقائق ہیں" جیسی کتابوں سے رجوع پر آمادہ کرنے کیلئے نوائے وقت کوئی ٹھوس قدم اٹھا سکتا ہو تو اسے واقعی پاکستانیت پر غیر متزلزل ایمان اور اس کے متعلق غیر لچک دار موقف کی دلیل سمجھا جائے گا (اور نظریہ پاکستان سے لگاؤ کے اس اصل تقاضے کو نظر انداز کر کے نوائے وقت جس طرح بغیر کسی ربط و تعلق کے قیام پاکستان سے پہلے کے کردار کو بیچ میں لا کر خلط مبحث کا ارتکاب کرتا رہتا ہے' اس سے اس مقدس موضوع کو اپنی ذاتی پسند و ناپسند کیلئے استعمال کرنے کا تصور بھی ابھرتا ہے۔ دینی جماعتوں اور مسلم لیگ کے تعلقات اس وقت کا زندہ اور اہم ترین موضوع ہے۔ حقائق و واقعات اور مستقبل کی ملی ضرورت و توقعات کے حوالے سے اس موضوع پر سوچ وچار' بالخصوص ان میں دوبارہ مفاہمت کے اسباب پر غور و فکر وقت کی سب سے بڑی پکار ہے؎ لیکن نصف صدی پہلے کے کردار کو بنیاد بنا کر طعن و تشنیع کا دروازہ کھولنے

؎ خیال رہے کہ یہ مضمون اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب کہ ملک پر مسلط نسوانی قیادت کی لوٹ کھسوٹ اور انتہائی ناقابل فہم پالیسیوں کی وجہ سے ملک کا حساس اور باشعور طبقہ اور عوام اٹھے تھے۔

سے اس سلسلے میں کسی پیش رفت کی بجائے مزید پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔

تاہم اگر پرانی باتوں کا حوالہ ضروری ہی ہو تو پھر صحیح حقائق کا ادراک کرتے ہوئے ان کا دیانتدارانہ اظہار ضروری ہے' لیکن افسوس ہے کہ نوائے وقت نہ صرف اس میں ناکام رہا ہے بلکہ فرقہ واریت اور "مسلک" کی اس دلدل میں پھنس گیا ہے جس سے نکلنے کا وہ قوم کو بالخصوص علماء کرام کو ہمیشہ مشورہ دیتا چلا آرہا ہے۔

نوائے وقت کے مذکورہ اداریوں میں ایک طرف تو ایک مخصوص مکتبہ فکر کو "سواد اعظم" اور "اہل سنت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسری طرف مجلس احرار اور "کانگریسی علماء دیوبند" کی طرف سے تحریک پاکستان کی مخالفت کا تو ذکر کیا ہے لیکن علماء دیوبند کے ایک بڑے طبقے کی طرف سے بالخصوص جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم پر اس کی جو انتہائی مؤثر حمایت ہوئی ہے' اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے جب کہ دوسرے مکتبہ فکر کے بارے میں یہ لکھ کر کہ "مسلمانوں کے سواد اعظم نے تحریک پاکستان میں جوش وولولے کے ساتھ شرکت کی' اہل سنت کے علماء کرام' مشائخ عظام اور پیران طریقت نے دامے' درمے' سخنے' قائداعظم کی آواز پر لبیک کہا اور ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالا"۔ اس مکتبہ فکر کی جانب سے تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کی جو مخالفت ہوئی تھی اسے بالکل گول کر دیا گیا ہے' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر مکتبہ زیست میں تحریک پاکستان کی حمایت اور مخالفت کرنے والے دونوں طرح کے لوگ موجود تھے۔ خود بریلوی مکتبہ فکر کی طرف سے بھی مسلم لیگ اور اقبال و جناح کے خلاف سخت ترین فتوے دیئے گئے۔

کسی فرقے کی کتابوں کے حوالوں کے ذریعے ان کے ماضی کی جانچ اور اس کی بنیاد پر طعن و تشنیع کا انداز "الصیانۃ" کے مزاج اور اس کے بنیادی مقاصد سے میل نہیں کھاتا لیکن نوائے وقت میں فرقہ وارانہ بنیاد پر بحث چھیڑنے کی وجہ سے بدرجہ مجبوری اور انتہائی افسوس کے ساتھ چند حوالہ جات پیش کرنے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔

(۱)۔۔۔۔ ایک بریلوی عالم مولانا ابوالطاہر محمد طیب داناپوری نے رسالہ "قہر القادر علی الکفار اللیاذر" "میں دنیا کے بندوں" "پیٹ کے کتوں" "پیٹ اور لعنت کی روٹی کی خاطر اسلام اور مسلمانوں کو الٹی چھری سے ذبح کرنے والوں" کی لمبی فہرست شمار کی ہے' اس میں "محمد علی جناح" اور "ڈاکٹر اقبال" کے نام بھی شامل ہیں۔ اسی رسالہ میں لکھتے ہیں کہ "انہی دین فروشوں میں سے دنیا پرستوں نے ایک جماعت بنائی ہے جس کا نام "مظلم لیگ بغلط مسمی بہ مسلم لیگ" ہے اس کا قائد و لیڈر محمد علی جناح ہے۔

(۲)۔۔۔۔ خانقاہ مارہرہ شریف (آستانہ بیعت مولانا احمد رضا خاں) کا فتویٰ ملاحظہ ہو: "کیا کوئی سچا ایمان دار مسلمان کسی کتے اور وہ بھی دوزخیوں کے کتے کو اپنا قائد اعظم سب سے بڑا پیشوا اور سردار بنانا پسند کرے گا؟"

(۳)۔۔۔۔ مولانا ابوالبرکات سید احمد ناظم دارالعلوم حزب الاحناف لاہور لکھتے ہیں: "لیگ میں مرتدین' منکرین ضروریات دین شامل ہیں' اس لئے اہل سنت و جماعت کا ان سے اتفاق واتحاد نہیں ہو سکتا یہاں تک، کہ وہ توبہ کریں۔ لیگ کے لیڈروں کو رہنما سمجھنا یا ان پر اعتبار کرنا منافقین و مرتدین کو رہنما بنانا اور ان پر اعتبار کرنا ہے جو شرعاً ناجائز ہے کسی طرح بھی جائز نہیں۔"

(۴)۔۔۔۔ مرکزی انجمن حزب الاحناف ہند لاہور کے فتوے کے مزید چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(الف)۔۔۔۔ "لیگ کی حمایت کرنا' اس میں چندہ دینا' اس کا ممبر بننا' اس کی اشاعت و تبلیغ کرنا' منافقین و مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا ہے اور دین اسلام کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔"

(ب)۔۔۔۔ "لیگی لیڈروں کے افعال و اقوال سے ان کی گمراہی مہر نیم روز سے زیادہ روشن ہے' مرتد تھانوی کو لیگیوں کی تقریروں میں شیخ الاسلام اور حکیم الامت کہا جاتا ہے' اشرف علی زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔" (تفصیلی حوالہ جات

کیلئے ملاحظہ ہو مطالعہ بریلویت از علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب ص ۸۲ تا ۸۶ /ج ۱)

الغرض بریلوی مکتبہ فکر میں بھی مسلم لیگ کی مخالفت کرنے والے موجود تھے' البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ جو زبان مذکورہ بالا فتوؤں میں استعمال کی گئی ہے وہ لیگ کا کوئی کٹر سے کٹر مخالف ذمہ دار دیوبندی عالم اپنے کسی فتوی میں استعمال نہیں کر سکا۔

بریلوی مکتبۂ فکر کی طرف سے مسلم لیگ کی مخالفت اتنی شہرت حاصل نہ کر سکی جتنی علماء دیوبند کی مخالفت نے کی ہے' اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بریلوی علماء کی تکفیری مہم اور دوسرے کاموں میں منہمک ہونے کی وجہ سے اجتماعی وملی امور میں ان کا کردار اوران کی سیاسی آواز نہ ہونے کے برابر تھی' چنانچہ جناب عبدالصمد پیرزادہ ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ تاریخ راولپنڈی "نہرو کمیٹی رپورٹ اور علماء کی سیاسی فکر" کے زیر عنوان مضمون میں علماء کے سیاسی کردار کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"تحریک خلافت میں بریلوی اور شیعہ مسلک کے مسلمانوں نے عمومی طور پر حصہ نہیں لیا' تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ہندوستانی سیاست میں صرف جمعیۃ علماء ہند اور آل انڈیا مسلم لیگ ہی سیاسی منظر پر رہ گئیں۔"

(سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد شمارہ ۴ ص ۴۸ ج ۳۲)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے نفاذ کے بعد قائد اعظم کی سربراہی میں آل انڈیا مسلم لیگ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ جو قائم ہوا تھا اس میں بھی آل انڈیا مسلم لیگ' جمعیۃ علماء ہند' مجلس احرار اسلام' پرجا پارٹی اور خلافت کمیٹی کے زعماء شامل تھے۔ اس بورڈ کے ارکان میں حضرت مدنی" حضرت مولانا کفایت اللہ اور مولانا سجاد احمد پھلواری وغیرہ بھی شامل تھے۔ جون ۱۹۳۶ء کے اجلاس میں قائد اعظم کو متفقہ طور پر صدر چنا گیا اور ایک چودہ نکاتی منشور منظور کیا گیا' پہلے نکتے کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

"مسلمانوں کے مذہبی حقوق کا تحفظ کرنا خالص مذہبی نوعیت کے امور میں جمعیۃ علماء ہند اور مجتہدین کی رائے معتبر خیال کی جائے گی۔" (حوالہ بالا ص ۵۶)

اس سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے کہ تحریک خلافت کے بعد ہندوستان کے سیاسی میدان میں "سواد اعظم" کا کوئی مستقل کردار نہیں تھا بلکہ مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء ہند ہی سیاسی منظر پر حاوی تھیں اور جمعیۃ علماء ہند میں غالب عنصر علماء دیوبند کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دینی حلقوں سے کانگریس کی مؤثر مخالفت اور مسلم لیگ کی حمایت بھی علماء دیوبند ہی کی طرف سے ہوئی اور زیادہ تر یہ طبقہ بھی جمعیۃ علماء ہند ہی کی کوکھ سے نکلا ہے' جس کی سب سے پہلی مثال مولانا مظہر الدین مدیر اخبار "الامن" کی طرف سے جمعیۃ کے الگ گروپ جمعیۃ علماء ہند کانپور کا قیام تھا' جنہیں بعد میں کانگریس مخالفت کی پاداش میں ۱۹۳۸ میں قتل کر دیا گیا تھا' پھر جمعیۃ علماء اسلام بھی مسلم لیگ کی حمایت کر رہی تھی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ جو جمعیۃ علماء ہند کی سرکردہ اور انتہائی ممتاز شخصیات میں رہ چکے تھے کی طرف سے اس کی قیادت قبول کر لینے کے بعد اس کی کوشش اور جدوجہد میں اور جان پڑ گئی اور تحریک پاکستان کی حمایت کرنے والی سب سے مؤثر اور متحرک دینی تنظیم بن کر ابھری جس نے تحریک پاکستان میں دینی رنگ بھر کر اسے عامۃ المسلمین کے لئے قابل قبول بنایا اور اس میں اس مقصد کے حصول کے لئے نیا جوش وولولہ بھرا۔ دوسری طرف حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی تائید وحمایت سے تحریک پاکستان کو جو تقویت وحمایت ملی وہ محتاج بیان نہیں' حضرت تھانوی ہی ہندوستان کی وہ واحد شخصیت تھے جنہوں نے شروع ہی سے ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کی مخالفت کی تھی حتی کہ اس دور میں بھی جب کہ قائد اعظم ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلاتے تھے' اسی طرح آپ نے مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کے حصول کی خواہش کا اظہار بھی بہت پہلے کر دیا تھا۔ جمعیۃ علماء

اسلام اور حضرت تھانویؒ کے متوسلین و متعلقین کی ان موثر خدمات ہی کا اعتراف تھا
کہ جب پاکستان کی پہلی پرچم کشائی کا وقت آیا تو یہ خدمت "سواد اعظم" کے کسی عالم
یا کسی سیاسی لیڈر کی جائے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا
ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کو سونپی گئی۔ یہاں ان حضرات کی خدمت کی تفصیل بلکہ ان
کی طرف اشارہ کرنے کا بھی موقع نہیں ہے' اس کے لئے اس موضوع پر لکھی گئی
مستقل کتب و رسائل مثلاً پروفیسر سعید احمد صاحب کی "مولانا اشرف علیؒ اور تحریک
آزادی" اور منشی عبدالرحمٰن خاں مرحوم کی کتاب "تعمیر پاکستان میں علماء ربانی کا
کردار" کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

تحریک پاکستان کی حمایت کے سلسلے میں ایک اور طبقہ جس کا ذکر نہ کرنا
ناانصافی ہوگا اور وہ ہے مشائخ و سجادہ نشین حضرات بالخصوص مشائخ پنجاب و سرحد'
کہ ان کی اکثریت نے واقعی تحریک پاکستان میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ناقابل فراموش
ہے لیکن انہیں غلطی سے بریلوی مکتبۂ فکر میں شمار کر لیا جاتا ہے' اس میں شک نہیں
کہ ان کے ہاں بھی بہت سی بدعات اور رسوم مروج تھیں لیکن بریلوی مکتبۂ فکر کی
"اعلیٰ شخصیات" کے فتووں کی رو سے صرف اہل سنت ہی نہیں بلکہ مسلمان ہونے
کے لئے علماء دیوبند کو کافر و مرتد سمجھنا ضروری ہے جب کہ بیشتر مشائخ نہ صرف یہ
کہ بریلی کے فتویٰ تکفیر سے متفق نہیں ہیں بلکہ علماء دیوبند کے ساتھ بعض مسائل
میں اختلاف کے باوجود ان کے مداح ہیں' جس کی تفصیل حضرت اقدس سید نفیس
شاہ صاحب دامت برکاتہم کی کتاب "حکایت مہر و وفا" مولانا محمد عبداللہ بھٹروی
مدظلہ کی کتاب "علماء اہل سنت دیوبند اور مشائخ پنجاب" اور علامہ خالد محمود صاحب
مدظلہ کی کتاب "مطالعہ بریلویت" صفحہ ۱۳۱ تا ۱۶۶ جلد اول میں دیکھی جاسکتی
ہیں۔ علماء دیوبند کے ساتھ محبت و عقیدت رکھنے کے بعد بریلوی فتووں کی رو سے ان
کا جو حکم ہوگا وہ واضح ہے۔

ان گزارشات کا مقصد تحریک پاکستان میں بریلوی مکتبۂ فکر کے کردار کا
بالکلیہ انکار کرنا نہیں بلکہ ایک تو یہ بتانا ہے کہ ہر مکتبہ فکر میں جہاں پاکستان کی حمایت
کرنے والے موجود تھے وہیں مخالفین بھی موجود تھے' دوسرے یہ کہ جماعتی اور
مرکزی سطح پر تحریک پاکستان کی موثر اور واضح دینی حمایت علماء دیوبند ہی کی طرف
سے ہوئی ہے' دوسرے مکاتب فکر میں زیادہ تر علاقائی اور مقامی شخصیات نے حمایت
کی ہے جو بہر حال قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔ ان شخصیات میں مشائخ پنجاب و
سرحد کو بریلوی مکتبۂ فکر کے پلڑے میں نہیں ڈالا جاسکتا' تیسرے یہ کہ علماء دیوبند
میں سے بعض اکابر نے جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے جو تحریک پاکستان کی مخالفت
کی تھی اس کے زیادہ نمایاں ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت کی سیاست
میں مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء ہند مسلمانوں کی دو ہی جماعتیں نمایاں تھیں اور اسی کے
ساتھ ساتھ حمایت پاکستان میں بھی نمایاں کردار علماء دیوبند ہی کا رہا ہے۔

پھر پاکستان بن جانے کے بعد ملک کی بقاء کی خاطر جب بھی قربانیوں کی
ضرورت پیش آئی تو اس میں بھی "سواد اعظم" سے باہر ہی کے لوگ پیش پیش
رہے۔ ایک عشرے سے زیادہ عرصے تک افغانستان میں پاکستان کی بقاء کی جنگ لڑی
گئی۔ مدیر نوائے وقت اس میں کسی خوردبین کے ذریعے اپنے "سواد اعظم" کا کوئی
کردار دکھا سکیں تو ان کی بڑی نوازش ہوگی۔ اب کشمیر میں مجاہدین اپنی بے مثال
قربانیوں کے ذریعے بھارتی درندوں کا ناک میں دم کئے ہوئے ہیں اور انہوں نے
امریکی آشیرباد سے مقبوضہ کشمیر میں بوگس انتخابات منعقد کرا کے دنیا کی آنکھوں میں
دھول جھونکنے کے نرسہاراؤ کے سہانے خواب چکنا چور کر دیئے ہیں۔ ان تمام
کارناموں میں پاکستانی تنظیموں اور نوجوانوں کا بڑا ہاتھ ہے' یہ میدان بھی "سواد
اعظم" کے باہر کے علماء و طلبہ نے سنبھالا ہوا ہے "سواد اعظم" کا ان میں بھی کوئی
خاص نام و نشان نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان قربانیاں دینے والوں میں سے بعض

کے بزرگوں نے اگر قیام پاکستان سے پہلے اپنی دیانت دارانہ رائے کا اظہار کر دیا تھا تو نوائے وقت انہیں اور ان کے اخلاف کو آج تک معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور بغیر کسی ضرورت اور موقع کے ان کا ذکر لے آتا ہے اور دوسری طرف "سواد اعظم" کے سخت ترین فتووں سے در گزر کر لیتا ہے۔

دینی جماعتوں سے مسلم لیگ کی دوری کی دوسری وجہ نوائے وقت "اسلام اور پاکستان کے حوالے سے قدرے مختلف نقطۂ نظر" کو قرار دیتا ہے۔ اسلام کے حوالے سے مختلف نقطۂ نظر واقعی اس دوری کا سبب بنا ہے اور اسی دوری اور عدم مفاہمت کا تلخ مزہ آج پوری قوم چکھ رہی ہے' اس صورت حال کے ازالے کے لئے نوائے وقت نے جو مشورے دیئے ہیں ان کا خلاصہ یوں ہے:

(۱)۔۔۔۔ مسلم لیگ کو چاہئے کہ ان دینی عناصر پر زیادہ توجہ دے جو ۱۹۴۶ء سے اس کے نظریاتی اور مسلکی حلیف چلے آرہے ہیں۔

(۲)۔۔۔۔ اس کی وضاحت چند سطروں کے بعد یوں کی گئی ہے کہ جمعیۃ علماء پاکستان کی دھڑے بندی ختم ہو جائے اور مولانا نورانی اپنی ضد اور ذاتی ناپسندی کو چھوڑ کر مسلم لیگ کا ساتھ دینے پر تیار ہو جائیں تو مسلم لیگ اور جمعیۃ دونوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ دونوں جماعتیں ۱۹۴۶ء کی سطح پر آسکتی ہیں' جب سیاسی قیادت مسلم لیگ کے پاس تھی اور دینی معاملات میں علماء و مشائخ کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

(۳)۔۔۔۔ دینی عناصر کو چاہئے کہ وہ پاکستان کی بانی جماعت کو اپنی مقبولیت' اعتدال پسندی اور راست فکری ترک کر کے اپنے پیچھے چلنے پر مجبور نہ کریں۔

(۴)۔۔۔۔ مسلم لیگ کی اعتدال پسندی جسے چھوڑنے پر دینی عناصر مجبور کر سکتے ہیں کی کچھ وضاحت یہ ہے: "ملک کے باشعور عوام اسلام کو اقبال کے حوالے سے اور جمہوریت سیاست کو قائداعظم کے حوالے سے سمجھنا اور دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"مسلم لیگ بانیان پاکستان کے نظریات اور دعووں کی روشنی میں اسلام کے عملی اور حقیقی تقاضوں کی مکلف بھی ہے۔"

جہاں تک ایک خاص مکتبۂ فکر کے مسلم لیگ کے مسلکی حلیف ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا واقعی نوائے وقت یہ سمجھتا ہے کہ مسلم لیگ فرقہ واریت سے بالاتر مسلمانوں کی عمومی جماعت ہونے کی بجائے ایک مسلکی جماعت ہے جس کا مسلک متعین ہے اور اگر واقعی مسلم لیگ کا کوئی مسلک ہے یا تھا تو وہ جمعیۃ علماء ہند والا مسلک کیوں نہیں ہو سکتا؟ جس کی رائے کو معتبر خیال کرنے کا فیصلہ ۱۹۳۸ء میں قائداعظم کی زیر صدارت کیا گیا تھا یا وہ مسلک جمعیۃ علماء اسلام کا مسلک کیوں نہیں ہو سکتا جو تحریک پاکستان کی حمایت کرنے والی سب سے مؤثر دینی جماعت تھی اور جس کے اکابر مسلم لیگی رہنماؤں کے زیادہ قریب اور معتمد تھے اور انہیں اولیں پرچم کشائی کے لئے منتخب کیا گیا تھا' انہی کی کوششوں اور محنتوں سے تیار ہونے والی قرارداد مقاصد مسلم لیگ نے اسمبلی سے منظور کروائی تھی اور قائد ملت کی طرف سے اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنے کے لئے مقرر کردہ بورڈ کے صدر اسی مسلک اور مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے علامہ سید سلیمان ندویؒ اور اہم ارکان میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ شامل تھے' وہ مسلک حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا کیوں نہیں ہو سکتا جنہیں خود قائداعظم نے ہندوستان کا سب سے بڑا عالم دین قرار دیا تھا اور اگر مسلکی حلیف ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ مسلک بحیثیت مسلک مسلم لیگ کا حمایتی اور حلیف رہا ہے تو نوائے وقت کے پسندیدہ مسلک کے بارے میں اس بات کا خلاف واقع ہونا پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔

پھر مدیر نوائے وقت کی سوئی نہ معلوم ۱۹۴۶ء پر کیوں رکی ہوئی ہے جب کہ ملک کا باشعور اور دردمند طبقہ ۱۹۸۸ء' اور ۱۹۹۰ء والی پوزیشن کی بحالی کا خواہش مند بلکہ اس کے لئے بیتاب ہے تاکہ متفقہ منشور کے ساتھ اگر ایک طرف مسلم

لیگ نفاذ اسلام کی داعی جماعت بن کر ابھرے تو دوسری طرف بیشتر دینی جماعتیں
اس کی اتحادی اور حلیف بن کر ملک کو بدترین حالات سے دوچار کرنے والی جماعت
کے راستے میں مضبوط دیوار بن سکیں۔ جانبدارانہ اور یکطرفہ رویہ اختیار کرنے کی
بجائے ۱۹۹۰ء کے تجربے کی ناکامی کے اسباب پر غور کر کے ہر فریق کو اس کی
غلطیوں کا احساس دلا کر ان اسباب کا ازالہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے‘ یہی ملک و
ملت اور خود مسلم لیگ کی ہمدردی کا تقاضا ہے اور یہی ”وقت کی نوا“ ہے۔ جناب مجید
نظامی صاحب بھی اگر اس کی ضرورت محسوس فرمائیں اور مسلم لیگ کو استغناء یا ایک
ہی مکتبۂ فکر پر انحصار کا مشورہ دینا ضروری نہ سمجھیں تو وہ بھی اس سلسلے میں اپنا کردار
ادا کر سکتے ہیں بشرطیکہ نوائے وقت میں لکھنے والے ذرا محتاط رویہ اختیار کریں اور ضد
بازی کی فضا میں اضافے کی بجائے مصالحانہ کردار کی صورت اختیار کریں اور دوسری
طرف والوں کو بھی اس طرف لانے کی کوشش کریں۔

جب اسلام کا ذکر آتا ہے تو عموماً مدیر نوائے وقت اسے قائداعظم اور
بانیان پاکستان کی فکر کے ساتھ بالعموم اور فکر اقبال کے ساتھ بالخصوص مقید کر دیتے
ہیں‘ اس میں شک نہیں کہ اپنے اشعار کے ذریعے قوم میں ملی جوش و ولولہ پیدا
کرنے‘ مایوسی اور ناامیدی سے ٹھٹھری ہوئی نوجوان نسل میں نئی زندگی اور حرارت
ایمان پیدا کرنے‘ مادیت کی دلدل میں پھنسی ہوئی بلکہ مدرسہ (جدید تعلیم گاہ) میں
دم گھٹے ہوئے نوتعلیم یافتہ لوگوں کو آہ سحر اور لا الہ الا اللہ کی اہمیت کا احساس دلانے‘
کارزار حیات میں عقل پر عشق کی برتری اور عظمت کو متعارف کروانے‘ اجتماعی و ملی
زندگی کی تشکیل میں مغرب کی دریوزہ گری اور شاگردی کی بجائے ملی خودی اور امید
بہار کے لئے شجر سے پیوستہ رہنے کا سبق دینے اور آخر میں ہندوستان میں مسلمانوں
کی الگ مملکت کے تصور کے لئے مؤثر آواز اٹھانے کے حوالے سے اقبال ہمارے
عظیم قومی ہیرو ہیں‘ اسی طرح تحریک پاکستان میں قائدانہ کردار‘ تمام طبقات فکر کو

ساتھ لے کر چلنے‘ اپنی سیاسی سمجھ بوجھ اور قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے تحریک
پاکستان کو منزل مقصود تک پہنچانے کی وجہ سے قائداعظم کی عظمت کا انکار ناممکن
ہے۔ اس حوالے سے ان کی شخصیات غیر متنازعہ ہیں‘ ان کے احترام کا تقاضا یہ ہے
کہ ان کی عظمت کو اسی حوالے سے متعارف کرایا جائے‘ انہیں کسی ایسے میدان میں
نہ گھسیٹا جائے جہاں ان کی شخصیت متنازعہ بن جائے‘ ان حضرات کو شارح دین اور
شارح دین بھی ایسا کہ ان کی تشریح و تعبیر کے مطابق ہی ملک میں اسلام نافذ ہو سکے‘
بنا کر پیش کرنے سے یقیناً یہ لوگ متنازعہ بن جائیں گے۔ اسی لئے قائداعظم نے تو
تشریح دین کو اپنا موضوع ہی نہیں بنایا اور علامہ اقبال نے ”تشکیل الٰہیات جدیدہ“
وغیرہ میں جن افکار کا اظہار کیا ہے وہ انتہائی متنازعہ ہیں اور دینی علوم سے مناسبت
رکھنے والا بیشتر طبقہ اس سے اچھا خاصا اختلاف رکھتا ہے۔ مدیر نوائے وقت فکر اقبال
پر مبنی اسلام پر اصرار کرنے سے پہلے کم از کم ”سواد اعظم“ اور مسلم لیگ کے مسلکی
حریف مکتبہ فکر کے عام علماء ہی سے رائے لے لیتے تو مناسب تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ امت مسلمہ کی تاریخ عظیم شخصیات‘ محسنین‘ ابطال
اور ہیروز سے بھری پڑی ہے‘ لیکن کسی شخص کو شارح اور ترجمان دین کے منصب پر
فائز کرنے کے سلسلے میں امت نے کبھی ایسی فراخدلی سے کام نہیں لیا کہ کسی بھی
شعبہ میں کسی کی نمایاں کارکردگی اور امت پر احسانات کے صلہ میں اس کے قول کو
دین میں حجت تسلیم کر لیا جائے۔ صلاح الدین ایوبی کی ہی مثال لیجئے وہ امت کے
لئے ایسے محسن اور ہیرو ہیں کہ آج تک صدیاں گزر جانے کے باوجود امت کا بچہ بچہ
ان کے نام سے واقف ہے لیکن امت نے کبھی انہیں یہ مقام نہیں دیا۔

لادینی‘ نسلی اور وطنی قومیت میں تو یہ ہوتا ہے کہ آزادی کے رہنما ہی اس
قومیت کے بانی تصور کئے جاتے ہیں اور قوم کی اجتماعی زندگی کی تشکیل میں ان کے
اقوال حرف آخر سمجھے جاتے ہیں‘ لیکن پاکستان اسی وطنی قومیت کی مخالفت کر کے

مسلم قومیت کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا ہے۔ تحریک پاکستان کے قائدین دراصل نئی قومیت کے بانی نہ تھے بلکہ صدیوں سے موجود قومیت کا احیاء کرنے والے اور اس کے خادم تھے۔ ان عظیم قائدین کو عام وطنی قومیت کے بانیاں والا مرتبہ دینا خود اس مملکت کی اساس کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہوگا' جس قومیت کی بنیاد پر یہ مملکت وجود میں آئی ہے اس کی بنیاد آج سے چودہ سو سال پہلے سید الکونین فخر موجودات نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں رکھی جا چکی تھی۔ اس قومیت کی اساس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دی ہوئی قرآن وسنت کی تعلیمات ہیں جن کی تشریح و تعبیر کے بنیادی اصول بھی خود قرآن وسنت میں وضع کر دیئے گئے ہیں جن کی مزید توضیح قرون اولیٰ کے علماء کبار کے ذریعے ہو گئی ہے' انہی کی روشنی میں دین کی تشریح کا سلسلہ صدیوں پر پھیلا ہوا ہے' ملک کے نظام کو بھی اسی تناظر میں طے کرنا چاہئے۔

جس طرح اقبال و قائد وغیرہ اس خطے کے مسلمانوں کے ہیروز ہیں اسی طرح مسلمانوں کے دوسرے خطوں کے بھی ابطال و محسنین موجود ہیں' اس طرح ہر زمانے اور ہر خطے کے مسلمان اپنے ان محسنین کے اقوال ہی کو دین میں حرف آخر سمجھنے لگ جائیں تو ہر زمانے اور ہر خطے کا اسلام الگ الگ ہوگا اور یہ چیز یقیناً اسلام کی آفاقیت اور ہمہ گیری کے خلاف ہوگی۔

شاید یہی وجہ ہے کہ خود مسلم لیگ کے اکابر نے کبھی اسلام کو اس طرح مقید و محبوس کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور نہ ہی اس کی تشریح و تعبیر کو کسی کی ذات سے وابستہ کیا بلکہ فَسْئَلُوٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کے اصول کے پیش نظر ۱۹۳۶ء میں تو قائداعظم کی زیر صدارت آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے یہ طے کر لیا تھا کہ دینی معاملات میں جمعیۃ علماء ہند کی رائے کو ترجیح دی جائے گا۔ اس وقت علامہ اقبال بھی بقید حیات تھے انہوں نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہ کیا' اس کے بعد تحریک پاکستان کا دور آیا تو اس میں بھی یہی کہا گیا کہ

یہ ملک اسلام کے لئے حاصل کیا جا رہا ہے' نہ تو قائدین نے خاص قسم کے کسی اسلام کا نعرہ لگایا اور نہ ہی عوام المسلمین نے یہ سوچ کر مسلم لیگ کی تائید و حمایت کی۔ قیام پاکستان کے بعد جب قرارداد مقاصد بانیان پاکستان نے منظور کی تو اس میں اسلام کو قرآن اور سنت تک محدود رکھا گیا پھر ملک میں کئی دستور بنے اور ٹوٹے لیکن کسی میں بھی اقبال یا قائد کے اسلام کا کوئی تصور نہیں ملتا' پھر یہ کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ ملک کے باشعور عوام اسلام کو اقبال کے حوالے سے سمجھنا چاہتے ہیں۔

ہاں البتہ قانونی' سیاسی اور معاشی شعبوں میں اسلام نے مباحات کا ایک بہت وسیع دائرہ چھوڑا ہے جس میں ہر دور کے اہل رائے زمانے کی مصلحتوں کے مطابق جو بھی تجویز کرتے ہیں شرعاً وہ درست سمجھا جاتا ہے' اس دائرے میں ملک و قوم کی اجتماعی مصالح دیکھتے ہوئے ان قائدین کے فرمودات سے استفادہ کی کوئی عقل مند مخالفت نہیں کر سکتا۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمیں فرقہ اور مسلک کے حوالے سے بات کرنا پڑی' اس میں بھی دل آزاری کے انداز سے گریز اور اعتدال پسندانہ اظہار حقیقت کے اسلوب کو اپنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے' پھر بھی ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کاش نوائے وقت اس انداز سے اس بحث کو نہ چھیڑتا اور یہ دقت اور توانائی کسی اور بہتر مصرف میں استعمال ہو جاتے۔